مشاہیرِ ہند

حصّہ اوّل

از

سیّد بادشاہ حسین حیدرآبادی

مصنف "اُردو میں ڈراما نگاری"

مرتب دیوان تاباںؔ وغیرہ

ناشر

سیّد عبدالقادر اینڈ سنس پرنٹر پبلشرز

چارمینار حیدرآباد دکن

طبع اول

مئی سنہ ۱۹۳۶ء

قیمت فی جلد

ایک روپیہ

فہرست

کائنات میں سب سے دلچسپ مخلوق انسان ہے اور اس کی زندگی بلا مبالغہ دلچسپ ترین کارنامہ ہے اسلئے سوانحی ادب کا دلچسپ ترین ہونا یقینی ہے۔ مشاہیر کی زندگیاں محض دلچسپ ہی نہیں ہوتیں بلکہ نصیحت آموز بھی ہوتی ہیں۔ اُن ہی کے مطالعہ سے ہمیں اُس زمانہ کے مختلف رجحانات کا پتہ چلتا ہے' علمی و ادبی ترقیوں کا سراغ ملتا ہے' سیاسی اور سماجی اصلاحات کا حال معلوم ہوتا ہے' غرض یہ کہ ان تمام تحریکات کی تفصیل جن سے اُس عہد کی تاریخ مرتب ہوتی ہے ان ہی مشاہیر کی زندگیوں میں نظر آتی ہے۔

ہندوستان کا عہد حاضر جس نازک دور سے گذر رہا ہے اگر آپ اسکی جزئیات کا حال معلوم کرنا چاہیں تو دور جدید کے مشاہیر کی زندگیوں کا مطالعہ کریں۔ ٹیگور کے پیام میں روحانیت کی پرسکون تلقین ملے گی' اقبال کے کلام میں بقا' خودی کا درس ملے گا' اور سروجنی کی آتش نوائیاں آپ کی رگوں میں گرم خون دوڑائیں گی۔ رامن اور بوس کی تحقیقات' ایجادات اور انکشافات آپ کو ایک نئے راستہ پر لگائیں گی۔ گاندھی' جناح اور جواہر لال کی ایثار اور قربانیوں سے بھری ہوئی عملی زندگیاں آپ میں وطن پرستی کا جذبہ پیدا کریں گی۔ اور آغا خاں' شاستری اور اکبر حیدری کے کارنامے آپ کو بالغ النظری سکھائیں گے۔

زیر نظر تذکرہ میں عہد حاضر کے ایسے بارہ مشاہیر کے سوانح حیات شامل ہیں

جنہیں شہرت عام اور بقاء دوام کا شرف حاصل ہے اور جن کی دماغی صلاحیتوں پر نہ صرف ایک غلام ملک فخر کر سکتا ہے بلکہ آزاد اور ترقی یافتہ ملک بھی بجا طور پر ناز کر سکتا ہے۔

اس تذکرہ کو سہولت کی خاطر دو حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ زیر نظر حصّہ میں آغا خاں، اقبال، اکبر حیدری، بوس، ٹیگور اور جواہر لال کے سوانح حیات شامل ہیں اور دوسرے حصہ میں۔ رے، رامن، سروجنی، شاستری، جناح اور گاندھی کے حالات درج ہوں گے۔

ابجد واری فہرست اس لئے مرتب کی گئی کہ اول و آخر کا سوال ہی پیدا نہونے پائے دیباچہ ختم کرنے سے پہلے ایک ضروری بات یہ کہنی ہے کہ رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری کے سوانح حیات میں آپ کے صدر اعظم باب حکومت ہونے کی خبر محض اس لئے درج نہیں ہو سکی کہ کتاب کا یہ حصہ آپ کے اس عہدہ پر فائز ہونے سے قبل چھپ چکا تھا فقط

سید بادشاہ حسین

۱۶ امر مئی ۱۹۳۷ء
نور خاں کا بازار
حیدرآباد دکن

ہز ہائینس آغا خاں



ہز ہائنس سر آغا خان

ساری حکومت ان ہی کی تھی۔ برائے نام کمانڈران چیف مقرر ہوئے اور کرمان کی گورنری بھی عطا ہوئی۔ کرمان کا گورنر اس وقت فتح علی شاہ کا ایک لڑکا تھا لیکن چونکہ موجودہ بادشاہ کی زندگی کے لئے اس کا وجود خطرناک تھا اس لئے انھیں کرمان سے نکال باہر کیا گیا اور مختلف قسم کی اذیتیں دی گئیں۔ اس کے بعد ایک عرصہ تک آغا حسین علی شاہ کی امن و آمان اور چین چان سے گذری۔ لیکن کچھ دنوں بعد ملک میں سیاسی انتشار رونما ہوا اور انھیں حاکم وقت کے خلاف علم لغاوت بلند کرنا پڑا۔ اس معرکہ میں وہ قید کر لئے گئے لیکن پچھلی کارگذاریوں کے صلہ میں انھیں معاف کر دیا گیا۔ مگر اب نظم و نسق کی حالت دگرگوں ہو گئی اور انقلاب کی آگ روز بروز ملک کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک پھیل رہی تھی۔ انہوں نے دوبارہ مخالفت پر کمر باندھی لیکن اس دفعہ بھی انھیں ناکامی ہوئی۔ اب تو حوصلے پست ہو گئے اور انھیں سوائے فرار ہونیکے اور کوئی جان بخشی کی صورت نظر نہ آئی۔ افغانستان کے راستہ سے سندھ پہنچے جہاں اُن کے اسماعیلیہ فرقہ نے بڑی آؤ بھگت کی اور انھیں سر آنکھوں پر لیا۔ طبیعت جب یہاں ٹھکانے لگی تو انھیں پھر ایران پر دھاوا بولنے کی فکر ہوئی مگر ان کی کوشش بار آور نہ ہوئی۔ باوجود اس کے بھی انکی جنگجو طبیعت انہیں نچلے بیٹھنے نہ دیتی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی سے ملکر انہوں نے سندھ کے باغی امیروں کو زیر کیا اور ۱۸۳۹ء کی جنگ افغانستان میں انہوں نے انگریزوں کی بڑی مدد کی۔ اس کے صلہ میں حکومت برطانیہ نے انھیں ایک معقول وظیفہ مقرر کیا اور اعزازی "ہز ہائینس" کا خطاب دیا۔ ۱۸۴۵ء میں وہ بمبئی آئے اور یہاں بھی ان کے خوجہ پیروؤں نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہاں انہوں نے

اپنے آپ کو بہت طاقتور بنا لیا اور اسی فکر میں تھے کہ اپنی اس طاقت کو کام میں لائیں کہ حکومت ایران کے مشورہ پر انھیں بمبئی چھوڑنے کے لئے کہا گیا۔ وہ کلکتہ میں رہنے لگے۔ اس کے بعد بنگلور پہنچے اور رفتہ رفتہ وہ پھر بمبئی میں آنے جانے لگے۔ ۱۸۸۱ء میں ان کا انتقال ہوا اور ان کے لڑکے آغا علی شاہ ان کے جانشیں ہوئے۔

پیدائش اور ابتدائی تعلیم | ۱۸۷۷ء میں ہز ہائنس سر سلطان محمد شاہ موجودہ آغا خاں بمقام کراچی پیدا ہوئے۔ ابھی یہ دس برس ہی کے تھے کہ ان کے والد کا سایہ ان کے سر سے اٹھ گیا "خوش قسمت تھا میں" آغا خاں کہتے ہیں "کہ ایسے مصیبت کے وقت میں مجھے ایسی ماں کی سرپرستی حاصل ہوئی جس کی دور اندیشی اور معاملہ فہمی نے میرے الجھتے ہوئے کاروبار کو سنبھال لیا۔ میری ماں مشہور ایرانی درباری نظام الدولہ کی صاحبزادی تھیں دربار سے محض اس لئے علٰحدہ ہوئی تھیں کہ وہ اپنی بقیہ عمر عبادت میں گذارنا چاہتی تھیں انہوں نے میری مصیبتوں کا اندازہ کر لیا اور میری تعلیم و تربیت کی طرف پوری توجہ کی"۔ آغا خاں کی ابتدائی تعلیم عربی اور فارسی میں ہوئی۔ اچھے علماء اور اساتذہ سے انھیں سابقہ پڑا اور انہوں نے ان دونوں زبانوں کے ادبیات کے ساتھ ساتھ تاریخوں کا بھی مطالعہ کیا۔ اس مشرقی طرز تعلیم کے علاوہ مغربی طرز کی انگریزی تعلیم بھی انھیں دی جانے لگی اور مشہور انگریز اساتذہ ان کے نگراں مقرر ہوئے۔

آغا خاں کو بچپن ہی سے اپنے چیلوں سے دلچسپی تھی۔ وہ اپنے آپ کو خوجوں کا پیشوا جانتے تھے اور خوجے بھی انھیں خاندانی طور پر "گرو" تسلیم کرتے تھے۔ خوجہ فرقہ زکوٰۃ پابندی سے دیتا ہے اور یہ آغا خاں کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔

آغاخاں کی خاندانی دولت اور یہ سالانہ آمدنی مل جل کر آغاخاں کو بیحد دولت مند بناتی ہے۔ اُن کے پیرو نہ صرف ہندوستان میں لاکھوں کی تعداد میں پھیلے ہوئے ہیں بلکہ دنیا کے مختلف حصوں میں ہیں جہاں وقتاً فوقتاً آغاخاں دورہ کرتے ہیں اور ان کی فلاح و بہبود کا خیال رکھتے ہیں۔ یہ فرقہ ابتدا ہی سے تجارت پیشہ رہا اور اسی کی ترقی میں کوشاں۔

آغاخاں کو اپنے فرقہ کا خدا خیال کرنا غلطی ہے۔

بعض لوگوں میں یہ خیال پھیل گیا ہے کہ ان کا فرقہ انھیں خدا سمجھکر پرستش کرتا ہے۔ اس خیال کے لوگوں میں پنڈت جواہر لال نہرو بھی ہیں مگر دراصل اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ محض ظاہری حالات کے تحت اس قسم کی خیال آرائی کی گئی۔ بادی النظر میں ان کا فرقہ انھیں غیر معمولی احترام و عظمت کا مستحق خیال کرتا ہے اور ان کا ادب، و لحاظ عوام کو گمراہ کرنے کا باعث ہوا۔ نہ انہوں نے کبھی اپنے آپ کو خدا کہا اور نہ ان کا فرقہ ایسا خیال کرتا ہے بلکہ وہ اپنے آپ کو پیغمبر بھی نہیں خیال کرتے۔ ان کی وہی عظمت ہے جو رومن کیتھلک فرقہ میں پوپ کی۔ انھیں ایک مذہبی ڈکٹیٹر پیشوا یا قائد سمجھنا چاہیئے۔ ڈاکٹر اقبال نے نہرو کی اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے دکھایا ہے کہ انھوں نے خود ہی حال میں نماز کے بعد اپنی تقریر میں واضح کر دیا کہ ان کا فرقہ عام مسلمانوں کے سے عقائد رکھتا ہے اور انھیں پر عمل کرتا ہے۔

یورپ کا پہلا سفر

یورپ کے پہلے سفر میں بھی آغاخاں نے غیر مانوس فضا کی شکایت نہیں کی۔ دراصل ان کی تعلیم و تربیت اور

اعلیٰ قابلیت نے نہ صرف انگلستان میں ان کا اچھا اثر پیدا کیا بلکہ سارے یورپ میں بھی جہاں جہاں وہ گئے ان کی بڑی آو بھگت ہوئی۔ انگلستان کے بڑے مدبروں نے ان کے متعلق اچھے خیالات کا اظہار کیا۔ ملکہ وکٹوریہ نے کئی بار ان سے ملاقاتیں کیں اور متعدد مرتبہ انہیں ڈنر پر بلایا اور ونڈسر کاسل میں انہیں بطور مہمان ٹھہرایا ابھی وہ انگلستان ہی میں تھے کہ کے۔ سی۔ آئی۔ ای کا خطاب انھیں دیا گیا۔ اس کے بعد سے آغاخاں یورپ کو وقتاً فوقتاً آنا جانے آنے لگے کہ یوروپین سوسائٹی میں اب وہ اجنبی نہیں خیال کئے جاتے۔ ان کی شخصی وجاہت۔ تہذیب اور قابلیت نے انکی دولت کا ساتھ دیا اور یورپ کے بڑے سے بڑے مدبروں میں وہ اسی طرح گھل مل گئے ہیں کہ گویا وہ بھی ان ہی میں کے ایک فرد ہیں۔

مسلم یونیورسٹی سرسید کے بعد ایم۔ اے۔ او کالج کی حالت تشویش ناک ہو رہی تھی اور اس وقت محسن الملک کے ہاتھوں میں اسکی عنانیں تھیں۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ہی اس کا پروپیگنڈا کرنے کا واحد ذریعہ تھا۔ ۱۹۰۳ء کے دربار تاجپوشی کے موقع پر کانفرنس کا جو اجلاس منعقد ہونے والا تھا۔ اس کی صدارت کیلئے ایسے شخص کی تلاش ہوئی جو اس کالج کی گرتی ہوئی حیثیت کو سنبھال سکے۔ محسن الملک کی نظریں آغاخاں پر پڑیں وہ نہ صرف خوجہ فرقہ میں ہر دل عزیز تھے بلکہ بمبئی میں عام مسلمان بھی ان کی حد درجہ عزت و احترام کرتے تھے۔ گو کہ وہ ابھی عمر کے لحاظ سے جوان ہی تھے لیکن خیالات کے لحاظ سے پختہ کاری جھلک رہی تھی۔ اسی زمانہ سے یہ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ مستقبل میں آغاخاں سارے مسلمانوں کے لیڈر ہوں گے۔ محسن الملک نے آغاخاں کے مستقبل کو بھانپ لیا۔

اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت کی دعوت دی۔

تاجپوشی کے دربار کا موقع تھا اس لئے والیان ریاست اور انگریز عہدہ داروں کی ایک کثیر جماعت آئی ہوئی تھی اور ان میں کی اکثر ہستیوں نے کانفرنس کے جلسہ میں شرکت کی اس لحاظ سے کانفرنس اس سال غیر معمولی طور پر کامیاب رہی آغا خاں نے جو خطبہ صدارت پڑھا وہ خطابت کا ایک اعلیٰ نمونہ ہونے کے علاوہ مطالب اور معانی کے لحاظ سے سوئے ہوئے مسلمانوں کو بیدار کرنے کا ایک موثر ذریعہ تھا۔ آغا خاں نے کہا کہ وہی مسلمان جو کل تک جہاں بان و جہاں دار و جہاں آرا تھے آج کس بیبرسی کی حالت میں قعر مذلت میں پڑے سسک رہے ہیں۔ وہی مسلمان جنہوں نے مصر اور بغداد کی تعلیم گاہیں قائم کی تھیں آج مسلم یونیورسٹی کی ضرورت پر غور نہیں کرتے انہوں نے زور دیا کہ ایک مسلم یونیورسٹی چاہیئے۔ اس کے لئے ایک کروڑ روپیہ کا چندہ فی الحال فراہم کیا جائے انہوں نے کہا کہ:۔

اُس یونیورسٹی میں موجودہ علوم کے پہلو بہ پہلو تاریخ اسلام کے ان زرین اوراق کی بھی خاص طور پر تعلیم ہو جہاں کہ مسلمانوں کی عظمت کا ذکر ہے اور اس مذہب کی بھی تعلیم ہو جس نے سارے مسلمانوں میں اخوت کا بیج بویا۔ چونکہ یہ رہائشی یونیورسٹی ہوگی اس لئے یہ آکسفورڈ کے طرز کی پیروی کرے گی یقیناً اس کا قیام مشکل اور صبر آزما ہے لیکن کیا سارے مسلمان اس قسم کی یونیورسٹی کا سنگ بنیاد رکھنے پر کمر بستہ ہیں جو ان کے کھوئے ہوئے ماضی کو مستقبل کے

آئینہ میں رونما کر دے؟ کیا مسلمان اس قدر بے حس ہو گئے
ہیں کہ ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی؟ کیا انہیں احساس
پستی نہیں ہے؟ اور اگر ہے تو کیا وہ اپنی دولت میں سے
کچھ روپیہ اس یونیورسٹی کے قیام کے لئے نہیں دیں گے؟
مجھے توقع ہے کہ اس تحریک سے ہم اپنے مستقبل کو
سنواریں گے اور اگر اب بھی ہم بیدار نہ ہوں تو مجھے کہنے
کی اجازت دیجئے کہ ہم اسلام کے خیر خواہ نہیں ہیں اور
ہمیں اسکی موت اور زندگی کی فکر نہیں ہے"۔

مسلم یونیورسٹی کی ضرورت کا احساس غیر مسلم افراد کی ناراضی کا باعث ہوا۔ ان کے خیال میں اس طرح کی قومی یونیورسٹی کی ضرورت نہ تھی اور موجودہ ہندوستانی یونیورسٹیوں کی موجودگی میں ایسی تخصیص اس امر کی دلیل تھی کہ مسلمان دیدہ و دانستہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ بنانا چاہتے ہیں۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کا فرض بھی آغا خاں کے تفویض کیا گیا اور انہوں نے اپنا پورا زور بیان صرف کر کے باور کرایا کہ اس کوشش کا مقصد مذہبی تعصب نہیں ہے بلکہ اسلامی کلچر کا احیاء ہے اور اس سے ظاہر ہے کہ ہندوستانی قومیت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ جہاں تک ہندوستانی مسائل کا تعلق ہے مسلمان بھی ہندو یا دوسرے اقوام کے ساتھ ہر طرح اشتراک عمل کے لئے کمر بستہ ہیں۔ علاوہ اس کے اس قسم کی یونیورسٹی کا قیام موجودہ طرز تعلیم کے خلاف احتجاج کی ایک نشانی ہے نہ کہ قومی اور مذہبی تعصب کی بنیاد۔ موجودہ طرز تعلیم اس قابل نہیں ہے کہ مسلمانوں کے اس درخشاں

ماضی کو لوٹا سکے جس کی ایک جھلک مصر۔ غرناطہ۔ ہسپانیہ اور بغداد میں چمک چکی ہے۔

اتنی سرگرمی اور مستعدی کے باوجود بھی وقت اس کا متقاضی نہ تھا کہ مسلم یونیورسٹی کا سنگ بنیاد اسی وقت رکھا جاتا۔ کئی سال بعد ۱۹۱۰ء میں حالات موافق ہوئے اور جب آغا خاں نے مشکلات پر قابو حاصل کیا تو پورے انہماک کے ساتھ چندہ فراہم کرنا شروع کیا اور بہت تھوڑے عرصہ میں تیس لاکھ روپیہ کا سرمایہ فراہم ہو گیا۔

امپیریل کونسل

اس عرصہ میں آغا خاں پر سارے مسلمانوں کو اعتماد حاصل ہو چکا تھا اور ان کی تعلیمی سرگرمی روشن خیال حضرات سے پوشیدہ نہیں تھی۔ ان حالات کے درمیان انہیں امپیریل لیجسلیٹو کونسل کا ممبر بنا لیا گیا جہاں انہوں نے بڑی دلچسپی سے کام کیا۔ تعلیمات کے متعلق انہوں نے ایک اسکیم پیش کی جس کی رو سے عام ابتدائی تعلیم کے رواج پر زور دیا گیا اور اس سلسلہ میں ان کی تحریکیں اور تقریریں عام طور پر ہر فرقہ میں مقبول ہوئیں۔ عوام کے علاوہ حکومت نے بھی ان کی صاف گوئی اور ضروری مطالبات کو قابل تعریف خیال کیا۔

آل انڈیا مسلم لیگ

ہندوستان کے طول و عرض میں سیاسی بیداری کے علامات آہستہ آہستہ پھیل رہے تھے اور مسلمانوں کے سوا دوسرے فرقے برابر میدان عمل میں آرہے تھے۔ سرسید اور ان کے رفقاء اب بھی اس پر تُلے ہوئے تھے کہ مسلمانوں کو سیاسیات کے میدان خارزار میں سنبھل کر قدم رکھنا چاہیئے لیکن جب لارڈ مورلے کی ایما سے انڈین لیجسلیٹو کونسل کو وسیع سے وسیع تر کیا جانے لگا تو ہندوستانی سیاست کے حالات ہی بالکل بدل گئے۔ ایسے موقع پر مسلمانوں کو بھی

قدم بڑھانا ضروری تھا ورنہ وہ غبار کارواں میں گم ہو جاتے۔ اس ماحول میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام آغا خاں کی سیادت میں عمل میں آیا۔ اس تحریک کی ابتداء کے متعلق خود آغا خاں بیان کرتے ہیں:۔

"مسلم لیگ کے قیام کی فوری ضرورت مجھے اُسی وقت محسوس ہوئی جبکہ میں ۱۹۰۶ء میں علیگڈھ آیا میں نے اپنا خیال مرحوم دوست نواب محسن الملک پر ظاہر کر دیا تھا اور انہوں نے اپنی کمال دانشمندی سے اس کو قبول کیا اور پہلا عملی قدم ۱۹۰۶ء ہی میں اُٹھایا جبکہ ایک وفد لارڈ منٹو سے ملاقی ہو کر اس چیز کو لارڈ صاحب پر بخوبی واضح کر دیا کہ ملک کے نظم ونسق میں مسلمانوں کا بھی ان کی آبادی اور اہمیت کے لحاظ سے ہاتھ رہنا ازبس ضروری اور قرین انصاف ہے"

کچھ عرصہ بعد جب ڈھاکہ میں محڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا تو نواب خواجہ سلیم اللہ صاحب کی تحریک پر مسلم لیگ کا خاکہ تیار ہوا۔ اور اس کے تھوڑے ہی دن بعد کراچی میں آغا خاں اس کے صدر نامزد کئے گئے۔

فرقہ وارانہ نمائندگی مسلم لیگ کے قیام ہی کی بدولت بعد کی نامزدگی میں مسلمانوں نے لیجسلیٹیو کونسل میں کافی جگہ حاصل کی۔ گو کہ بعض لوگوں نے اس فرقہ وارانہ ذہنیت کو ناپسند کیا بلکہ آوازے بھی کسے لیکن آغا خاں اور ان کے ساتھی سختی کے ساتھ اس پر ڈٹے رہے اور حقیقت یہ ہے کہ ان کے دلوں میں کھوٹ نہ تھی اور وہ ہمیشہ ہندوستان کے عام مسائل پر متحد ہونے پر ہر وقت

تیار تھے۔ دراصل ان کا مقصد مسلمانوں کی تنظیم اور سیاسی بے راہ روی کو رستہ پر لگانا تھا۔ ۱۹۱۰ء میں لیگ کے افتتاحیہ خطبہ میں آغا خاں نے کہا:۔

"میں خوش ہوں کہ ہماری کوششیں بارآور ہوئیں۔ اب جبکہ اصلاحات سرگرم عمل ہیں ہمارا خوش گوار فرض ہے کہ ہم ان کو قبول کریں میں اپنے ہندوستانی بھائیوں سے خواہ وہ مسلمان ہوں۔ ہندو ہوں پارسی یا عیسائی توقع رکھتا ہوں کہ وہ اشتراک عمل کریں گے اور ان اصلاحات کے ظہور پذیر ہونے میں روڑے نہ اٹکائیں گے۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ "سلف گورنمنٹ" ہمارے دروازے پر خیر مقدم کی منتظر کھڑی ہے۔ اب یہ ہمارے اختیار میں ہے کہ گورنمنٹ کے ساتھ مل کر اس کا پُر تپاک خیر مقدم کریں یا والہانہ جوش وخروش کو کام میں لا کر سرد مہری سے ٹھکرا دیں۔"

ہندو مسلم اتحاد حالانکہ آغا خاں مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے مسلمانوں کے مطالبات اور ضروریات کے علمبردار ہیں لیکن انھیں متعصب نہیں کہا جا سکتا۔ اپنے مطالبات پیش کرنے کے معنی دوسروں پر ظلم کرنے کے ہرگز نہیں ہو سکتے۔ تاریخ نہیں بتلا سکتی کہ کبھی بھی انھوں نے دوسرے فرقوں کے مراعات چھین کر ان کی حق تلفی کی ہو اور پھر ان سے مسلمانوں کو ناجائز فائدہ پہنچایا ہو۔ انھوں نے مسلمانوں کے حقوق مانگے اور ڈنکے کی چوٹ مانگے۔ مسلمانوں کی اصلاح کی کوشش کی اور علی الاعلان کوشش کی مگر دوسرے فرقوں کی دل آزاری بھی نہیں کی۔ دوسروں کے

حقوق غصب نہیں کئے اور غیروں پر نکتہ چینی نہیں کی۔ انہوں نے کہا:۔

"جیسا کہ ہم اپنے مذہب۔ تمدن اور اخلاقیات کو ہاتھوں سے کھونا نہیں چاہتے اور جیسا کہ ہم اپنے حقوق کے حصول کیلئے علیحدہ نمائندگی پر زور دیتے ہیں اسی طرح ہمیں اس بات کا بھی خیال رہتا ہے کہ ہمارے مطالبات حد سے تجاوز کر کے دوسروں کی دل آزاری کا باعث نہ ہوں خواہ وہ دوسرے فرقے ہوں خواہ گورنمنٹ۔

"جوں جوں وقت گذرتا جائیگا مجھے یقین ہے کہ تعلیم کے چرچے عام ہو کر ہمارے مذہبی تعصب کو گھٹاتے جائیں گے اور ایک دن وہ آئے گا جبکہ ہمارے ہاں مذہبی فرقوں میں تعصب کی کوئی جھلک نہ ہوگی اور ان کا وجود یورپ اور امریکہ کی فرقہ وارانہ تفریق کی طرح بے ضرر ہو کر رہیگا۔ اور یہی وہ توقع ہے جس پر ہندوستان کی بہترین امیدوں کا دارومدار ہے"

ابتدا ہی میں آغا خاں نے اس کا مظاہرہ کیا۔ ۱۸۹۳ء میں بمبئی میں جب ہندو مسلم فساد ہوا تو انہوں نے حتی الامکان کوشش کی کہ اس کو روکا جائے۔ جہاں تک ہو سکا انہوں نے بیچ بچاؤ کیا اور خصوصاً اپنے خاص فرقہ میں تو انہوں نے اس قدر سختی کے ساتھ حکم نافذ کیا کہ کسی خوجے یا آغا خانی نے اس جھگڑے میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ ۱۹۱۱ء میں جب الہ آباد میں ہندو مسلم کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا تو آغا خاں نے سرندرو ناتھ بانرجی۔ پنڈت مالویہ سرابراہیم رحمت اللہ۔ نواب وقار الملک۔ حسن امام۔

مظہر الحق اور جناح کے ساتھ اشتراک عمل کیا اور ہندو مسلم نفاق کو کم سے کم کرنے کے لئے اپنی پوری کوششیں ختم کر دیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ ہندو مسلم سوال ناپائدار ہے اور چونکہ دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں اس لئے بہت جلد وہ وقت آئے گا جب یہ دونوں فرقے اچھی طرح محسوس کرلیں گے کہ ان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

۱۹۱۲ء میں جب بنگال کے مشرقی اور مغربی حصوں کی تقسیم کا وقت آیا اور لارڈ کرزن نے تقسیم کرنے کی ٹھان لی تو سیاسی معاملات خصوصاً ہندو مسلم سوال نازک ترین حالت پر پہنچ چکا تھا۔ مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور اس طرح اس تقسیم سے مسلمانوں کا کافی فائدہ تھا لیکن دوسری طرف ہندوؤں کو اسی تقسیم سے نقصان پہنچ رہا تھا۔ اس لئے ہندوؤں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور مسلمان اپنے وسیع النظر لیڈروں کے مشورہ پر خاموش رہے۔ اگر دونوں طرف سے برابر کی زور آزمائی ہوتی تو یقیناً تقسیم نہ رکتی لیکن مسلمانوں کا سکوت لارڈ کرزن کی نظر ثانی کا محتاج ہوا اور یہ تقسیم منسوخ کرنی پڑی۔ اس موقع پر مسلمانوں نے جو فراخ دلی اور بلند حوصلگی کا ثبوت دیا وہ سب آغا خاں اور ان کے ساتھیوں کی ایما سے تھا۔ آغا خاں نے کہا:۔

> "یقیناً مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور اسکی تقسیم میں مسلمانوں کا بلاشبہ فائدہ ہے لیکن اس سے ہندو بھائیوں کو نقصان پہنچ رہا ہے اس لئے مسلمانوں کو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ایک صوبہ میں اکثریت حاصل کرکے

اپنے ساتھیوں کی مخالفت حاصل کرنا اور وہ بھی ایسی صورت میں جبکہ دوسرے صوبوں میں مسلمانوں کی اقلیت ہے میرے خیال میں کسی طرح عقلمندی کا فعل نہیں ہو سکتا۔ مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ اپنے فائدہ ہی پر نظر نہ رکھیں بلکہ اپنے ساتھیوں کا بھی خیال رکھیں۔ ان کے احساسات۔ ان کی خواہشات اور ان کے حقوق کا خیال کرنا اسلام کی شہرۂ آفاق رواداری کا سبق دھرانا ہے۔ اس لحاظ سے بنگال کی تقسیم منسوخ ہو جانے پر ہمیں ہمارے ہندو بھائیوں کے ساتھ ان کی خوشی میں برابر کا شریک ہونا چاہیئے اور والسرائے بہادر کا ممنون ہونا چاہیئے کہ انہوں نے برطانیہ کے روایتی تدبر اور دوراندیشی کو کام میں لاکر ہندوستان کے دو بڑے فرقوں کے تعلقات کو کشیدہ ہونے سے بچایا"

نہ صرف آغاخاں نے زبانی ہندو مسلم اتحاد کی تبلیغ کی بلکہ دامے اور درمے ہندو اور مسلمان دونوں اداروں کی ایک ہی طرح امداد کی۔ دکن ایجوکیشن سوسائٹی اور ہندو یونیورسٹی کو وہ برابر چندہ دیتے ہیں۔

جنوبی افریقہ سے دلچسپی

ہندوستانیوں کے لئے آغاخاں نے صرف ہندوستان ہی میں کام نہیں کیا بلکہ جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کی حالت کو بدلنے میں مہاتما گاندھی کا جو ساتھ انہوں نے دیا وہ زبان زدخاص وعام ہے۔ تقریر میں۔ تحریر میں۔ ہندوستان میں۔ انگلستان میں غرض کہ جہاں کہیں

وہ رہے انہوں نے برابر ہندوستانیوں کے لئے بہتر سلوک کی تحریک کی۔ نہ صرف تحریک کی بلکہ احتجاج کیا۔ انہوں نے اپنے شخصی اثرات کو کام میں لاکر برطانیہ کے بڑے بڑے مدبرین کو ہندوستان اور ہندوستانیوں کے حالات۔ ان کے ضروریات اور ان کے مطالبات سے آگاہ کرایا اور اکثر مواقع پر ان ہی سے فائدہ اٹھا کر بہت سے مشکلات کو رفع کروایا۔

محتاط سیاست داں

آغا خاں شروع ہی سے "خیر الامور اوسطہا" کے قائل ہیں۔ وہ گو کھلے اور سر پی مہتا کے طرف دار دل میں ہیں ان کا خیال ہے کہ حکومت کے خلاف والہانہ جوش۔ ابلہانہ ضد اور بیجا مخالفت کو کام میں لانا تعلقات کو اور خراب کرنا ہے۔ بالکل اسی طرح بیجا خوشامد۔ بے موقع بزدلی کا اظہار اور اپنے حقوق مانگنے میں بے وجہ کوتاہی کرنا اپنی وجاہت۔ حیثیت اور وقار کو ٹھیس لگاتا ہے۔ سر پی مہتا کی یادگار میں جو جلسہ لندن میں ہوا تھا اس میں انہوں نے نوجوان ہندوستانی طلبا کو مخاطب کر کے کہا:۔

"ہر وہ طالب علم جو یورپ سے ہندوستان واپس آتا ہے یہ خیال دل میں پرورش کرتا ہے کہ وہ بہت جلد ہندوستان کا لیڈر ہو جائیگا یا مجلس مقننہ کا ممتاز ترین رکن بنے گا یا حکومت کا اعلیٰ ترین عہدہ حاصل کرے گا۔

توقعات اور امیدیں بری چیز نہیں ہیں مگر ؎

امیدیں ٹوٹتی ہیں تو بہت صدمے گذرتے ہیں
امیدیں جسکی کم ہونگی اسے صدمے بھی کم ہونگے

میں انہیں نصیحت کروں گا کہ وہ خیال کی وسعت کے ساتھ ساتھ اپنی عملی زندگی کو بھی وسیع کریں اپنی نظروں کے آگے وہ گوکھلے اور سر پی مہتا کی زندگیاں رکھیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ ان کے نقوش قدم پر چلکر گمراہ نہوں گے اور بہت جلد منزل مقصود پر پہنچیں گے۔ انہیں بہت سی قربانیاں کرنی پڑیں گی۔ انہیں بہت سے مقامات پر چٹان کی طرح ثابت قدم رہنا پڑے گا۔ انہیں سخت سے سخت تنقیدیں اپنے کانوں سے سننی پڑینگی۔ انہیں وقت اور موقع کا انتظار کرنا پڑے گا ـــــ مگر ان سب کے بعد ایک وقت وہ آئیگا جبکہ وہ اپنے ملک اور وطن کی سچی خدمت کرسکیں گے ایسی کہ جس سے ان کا نام روشن ہو۔

جنگ عظیم جنگ عظیم میں آغا خاں نے انگریزوں کی بڑی مدد کی۔ تحریر اور تقریر کے علاوہ انہوں نے میدان کارزار میں بھی قدم رکھنے پر آمادگی کا اظہار کیا اور ایک "پرائیوٹ" کی حیثیت سے انہوں نے اپنا نام درج فہرست کرایا۔ "ریوٹر" کے نمائندے نے جب اُن سے دریافت کیا کہ کیا وہ واقعی جنگ میں "پرائیوٹ" کی حیثیت سے شریک ہونے پر آمادہ تھے تو انہوں نے جواب دیا:۔

"ہاں! میں کسی حیثیت سے بھی جنگ میں حصہ لینے کے لئے تیار تھا۔ افسوس ہے کہ مجھے کسی قسم کی بھی فوجی تعلیم نہیں ملی اس پر بھی اگر دفتر جنگ میری خدمات حاصل کرنے پر رضامند نکلا

اظہار کرے تو میں بڑی خوشی سے اپنے جسم پر آلات حرب
آراستہ کرونگا۔ اگر وہ مجھے موقع دیں تو میں حکومت برطانیہ کی
طرف داری میں اپنے جسم کا آخری خون کا خطرہ بھی گرانے
پر آمادہ ہوں"

انگلستان میں انڈین فیلڈ امبولینس کور "کو مخاطب کرتے ہوے انہوں نے کہا:۔

اگر میں سپاہی کی حیثیت سے میدان جنگ میں نہیں جاسکتا تو
مجھے توقع ہے کہ "ترجمان" کی حیثیت سے ضرور تمہارا ساتھ
دے سکتا ہوں۔ میں انگریزی فرنچ۔ جرمن اور ہندوستانی جانتا
ہوں اور میں نہیں سمجھتا کہ مجھ سے بہتر تمہیں کوئی اور ترجمان
مل سکیگا۔ اس پر بھی اگر میں تمہارا ساتھ نہ دے سکوں تو سمجھ لو
کہ کوئی ضرورت مجھے مجبور کر رہی ہے یا کوئی طاقت مجھے زبر
دستی روک رہی ہے"

ان ہی کارگزاریوں کے صلہ میں ملک معظم اور ان کی حکومت نے آغا خاں پر عنایات و مراعات کی بوچھاڑ کی۔ ان کی خدمات کا اعتراف نہ صرف زبانی جمع خرچ کی حد تک کیا گیا بلکہ بہت سے اعزازات بھی عطا کیے گئے۔ گیارہ توپوں کی سلامی کا اقتدار حاصل ہوا اور بمبئی پریسیڈنسی کے درجہ اول کے چیف کا اعزاز تاحیات ملا۔

وفاق ۱۹۱۸ء میں آغا خاں نے ایک کتاب دستوری اصلاحات کے متعلق شائع کی اس میں انہوں نے ہندوستان کی مشکلوں کا حل وفاق دکھایا ہے۔ آج سے اٹھارہ برس پہلے ان کے پیش نظر وفاق اور صوبہ داری خودمختاری تھا۔

گورنروں کا انتخاب وہ ہندوستانی حقوق کو پیش نظر رکھکر کرنے کے طرفدار ہیں۔ اگر عوام کو منتخب نہیں کیا جا سکتا تو والیاں ریاست میں سے اس اہم خدمت کے لئے افراد چنیں جائیں جو اپنی وجاہت کے اعتبار سے ہندوستانیوں میں ہر دل عزیز ہوں گے۔ وفاق کے معاملہ میں وہ امریکی اصول پسند کرتے ہیں اور ایگزیکٹیو کو لیجسلیچر سے بالکل علیحدہ اور آزاد رکھنا مناسب سمجھتے ہیں۔

مانٹیگو اصلاحات

مانٹیگو اصلاحات کو قبول کرتے ہوئے انہوں نے کہا:—

"گو کہ میں "سلف گورنمنٹ" کے لفظ کو ترجیح دونگا لیکن "ذمہ دارانہ حکومت" کے قبول کرنے میں بھی زیادہ پس و پیش نہیں کرتا۔ میرا مقصد یقیناً امریکہ اور سوئیٹزرلینڈ کے طریقے کی تقلید ہے لیکن یہاں بھی مجھے خیال ہے کہ ہندوستان کا دامن انگلستان سے باندھا جانا ہے نہ کہ امریکہ یا سوئیٹزرلینڈ سے اس لئے اس کورانہ تقلید سے ہٹ کر میں اس چیز کو قبول کرنے پر اظہار آمادگی کرتا ہوں جس سے ہندوستان کی عظیم الشان مملکت کی سیاسی اٹھان میں مدد ملتی ہو۔"

مشرق بعید اور برطانیہ

جس وقت برطانوی سختی کی وجہ سے مشرق بعید میں ایک انتشار سا پیدا تھا آغا خاں بھی مشرق کی دلچسپیوں میں اُلجھے ہوئے تھے۔ انہوں نے انگلستان کے اخباروں میں علی الاعلان صدائے

احتجاج بلند کی:۔

"تمام عمر میں انسانیت اور اس کی فلاح و بہبود کا طرفدار رہا ہوں۔ میں نے ہمیشہ ہندوستان اور برطانیہ کے تعلقات کو خوشگوار ترین بنانے کی فکر کی ہے اور یہ خوش آیند خواب ہمیشہ دیکھا کیا ہوں کہ ہندوستان "سلف گورنمنٹ" حاصل کر کے برطانیہ کی وسیع مملکت میں شامل رہے اور مجھے یقین ہے کہ میرے ہم خیال ہندوستان کے رہنماؤں میں بہت سے ہیں لیکن برطانیہ کی موجودہ پالیسی خصوصاً مشرق بعید کے سلسلہ میں انتشار پیدا کر رہی ہے سارے ہندوستان کی متحدہ آواز کو صدا بصحرا سمجھنا اور سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کی سفارش پر کانوں پر ہاتھ دھرنا ہندوستانی احساسات کو ٹھیس لگانا ہے اور میں اس کو "ہوم گورنمنٹ" کا قصور خیال کرتا ہوں"۔

خلافت ترکی نے جس وقت خلافت کا سلسلہ ختم کر دیا تو ہندوستان میں ایک انتشار سا پیدا ہو گیا۔ آغا خاں اور امیر علی نے اس میں زیادہ حصہ لیا ان دونوں کی متحدہ کوششوں کا نتیجہ وہ مشہور مراسلہ ہے جو انہوں نے عصمت پاشا کے نام ہندوستان کی نمائندگی کرتے ہوئے لکھا تھا اور جس میں انہیں آگاہ کیا گیا تھا کہ چودہ سو سال سے مسلمان اپنے خلیفہ کی عزت و احترام کرنے اور اسے اپنا پیشوا ماننے میں گذارے ہیں اور در اصل اسی خلافت کا نتیجہ تھا کہ

ساری دنیا کے مسلمان متحد الخیال تھے۔ اسلام کا جھنڈا خلیفہ کے ہاتھ میں تھا اور دنیا کے گوشہ گوشہ سے مسلمان اس کے سایہ میں پناہ گزیں تھے ایسی حالت میں خلافت کو ختم کر دینا اسلامی دنیا کے سالہا سال کے اتحاد کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا ہے۔ اس لئے وہ ہندوستان کی جانب سے ترکی کو غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔

گھوڑ دوڑ آغا خاں کو گھوڑ دوڑ کا بے انتہا شوق ہے۔ ہندوستان اور انگلستان میں ان کے مشہور اصطبل ہیں اور وہ گھوڑوں کی پرداخت خاص سلیقہ اور اہتمام سے کرتے ہیں۔ متعدد بار ان کے گھوڑوں نے ہندوستان کی بڑی بڑی شرطوں میں اور انگلستان کے شہرۂ آفاق گھوڑ دوڑوں مثلاً ڈربی وغیرہ میں اولیت کا شرف حاصل کیا۔

سر محمدؐ اقبال



ڈاکٹر سر محمدؒ اقبال

سر محمدؒ اقبال

ابتدائی تعلیم شیخ محمدؒ اقبال ۱۸۷۶ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے۔ اس زمانہ میں مغربی طرز تعلیم کا اتنا رواج نہ ہوا تھا کہ بچوں کی تعلیم ابتدا ہی سے انگریزی اسکولوں میں ہوتی۔ پرانی قسم کے مکتب اور مذہبی درسگاہ ابھی باقی تھے اور یہاں تعلیم و تعلم کا چرچا اسکولوں کے پہلو بہ پہلو جاری تھا۔ اقبال کو بھی انہیں مدارج سے گذرنا پڑا ایک دن جبکہ اقبال چوتھی جماعت میں اسکول میں تعلیم پا رہے تھے ان کے والد مولوی میر حسن صاحب کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ وہ چاہتے ہیں کہ اقبال اسکول کی تعلیم موقوف کر کے صرف دینیات کا درس حاصل کریں لیکن مولوی صاحب کی دور رس نگاہیں اقبال کے درخشاں مستقبل کی ایک جھلک دیکھ رہی تھیں اس لئے انہوں نے مسکرا کر جواب دیا "اقبال مسجد میں پڑھنے کے لئے نہیں بلکہ مکتب میں پڑھنے کے لئے پیدا ہوا ہے اور یہ مدرسہ ہی میں پڑھے گا"۔ مولوی صاحب کا اتنا اثر تھا کہ اقبال کے والد کو اصرار کی

جرأت نہ ہوئی اور وہ نیچی گردن کئے "آپ کی مرضی" کہہ کر رخصت ہو گئے۔

مولوی صاحب کا طرز تعلیم بالکل مشرقی تھا۔ وہ فیس یا نام و نمود کی لالچ میں پڑھایا نہ کرتے تھے بلکہ انہیں درس و تدریس سے عشق تھا اور وہ اپنی پوری توجہ اور محنت و مشقت صرف کر دیتے تھے۔ علاوہ ازیں چونکہ اقبال کو وہ غیر معمولی طالب علم سمجھ رہے تھے اس لئے ان پر وہ اوروں سے زیادہ وقت صرف کرتے تھے۔ عربی۔ فارسی اور ہر وہ علم جو السنہ مشرقیہ کے خزائن میں محفوظ ہے اس کی ایسی تعلیم دی کہ شاگرد استاد کے "دار العلوم" سے رخصت ہونے سے پیشتر ہی ایک فاضل روزگار شخصیت بن چکا تھا۔ اقبال نے شعر کہنا شروع کیا تو اتنا دل بڑھایا کہ انہیں اپنے آپ پر ناز ہونے لگا۔

مولوی صاحب کے درس کے ساتھ ساتھ اقبال اسکول کی تعلیم بھی پاتے رہے اور درجہ بدرجہ ترقی کر کے انٹرنس پاس کیا۔ پھر سیالکوٹ کالج کی تعلیم ختم کر کے گورنمنٹ کالج لاہور میں بی اے میں شریک ہوئے۔ اس زمانہ میں مسٹر آرنلڈ علی گڈھ کالج سے گورنمنٹ کالج لاہور آ گئے تھے اور انہیں اس وقت فلسفہ میں ایک خاص امتیاز حاصل تھا۔ اقبال کو بھی فلسفہ سے لگاؤ تھا اس لئے انہوں نے آرنلڈ صاحب کی سرپرستی کو غنیمت جانا اور فلسفہ پڑھنا شروع کیا بی۔ اے انگریزی اور فلسفہ میں خاص امتیازات کے ساتھ پاس کیا اور آرنلڈ صاحب کے مشورہ پر فلسفہ میں ایم۔ اے کرنے کی ٹھان لی۔ دو سال بعد یہ ڈگری بھی امتیاز کے ساتھ حاصل کر لی۔

شاعری کی ابتدا اقبال ابھی اسکول میں پڑھتے تھے کہ اشعار موزون کرنے لگے

شعر و شاعری کے چرچے اس زمانہ میں زبان زد خاص و عام تھے سیالکوٹ میں بھی ان دنوں ایک چھوٹا سا مشاعرہ ہوتا تھا۔ یہاں اقبال نے کبھی کبھی غزلیں پڑھنی شروع کیں۔ حضرت داغ اس دور کے ہر دل عزیز شاعر تھے۔ اس پر نظام دکن کی استادی نے ان کی شہرت میں چار چاند لگا دیئے سارے ہندوستان میں ان کی استادی کا غلغلہ بلند ہوا۔ اقبال کے کان بھی داغ کی تعریفوں سے گنگ ہو گئے۔ اس لئے انھیں داغ سے اصلاح لینے کا خیال ہوا۔ چونکہ شخصی تعلقات دوری مقام کی وجہ سے قائم نہیں ہو سکتے تھے اس لئے ڈاک کے ذریعہ تلمذ کا سلسلہ قائم ہوا۔ یہ انتظام کوئی نیا نہ تھا بلکہ داغ کے اکثر شاگرد اسی طریقہ کار پر عمل کرتے تھے۔ داغ کے کلام کی خصوصیت روزمرہ کی صفائی ہے اور اسی کا پرتو ابتدا میں اقبال کے کلام پر پڑا ندرت بیان اور بلند پروازی سے داغ کافی متاثر ہوئے اور انہوں نے بہت جلد کہا کہ اصلاح کی گنجائش نہیں ہے۔ اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ اکثر وہ کہا کرتے تھے کہ "مجھے اقبال جیسے شاگرد پر ناز ہے" اقبال کی عمر ابھی بیس بائیس سال ہی کی تھی کہ ایک مشاعرہ میں انہوں نے غزل پڑھی اور جب اس شعر پر پہنچے کہ ؎

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لئے　　قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

تو مرزا ارشد گورگانی مرحوم بے اختیار پھڑک گئے اور شعر کو بار بار پڑھوا کر دیر تک سر دھنتے رہے اور بولے "میاں اقبال اس عمر میں یہ شعر!"۔

رفتہ رفتہ اقبال نے گل و بلبل کا طلسم توڑ کر اصلاحی شاعری کی طرف قدم بڑھایا اور حالی۔ آزاد اور شبلی کے نقوش قدم پر چلنے کی کوشش شروع کی

۱۸۹۹ء میں انہوں نے "نالۂ یتیم" کے نام سے ایک سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی نظم انجمن حمایت اسلام لاہور میں پڑھی۔ پھر ایک نظم "کوہ ہمالہ" سے خطاب سنائی۔ اس میں انگریزی خیالات کی جھلک بہت نمایاں تھی اس کے ساتھ ساتھ انداز بیان اور بندش کی خوبیاں اتنی وافر تھیں کہ شاعری کا سنجیدہ مذاق رکھنے والوں کی نظریں اس ہونہار شاعر پر پڑنے لگیں۔ نظم کی قبولیت کا یہ عالم ہوا کہ ہر طرف سے فرمائشیں ہونے لگیں کہ اسے شائع کیا جائے۔ اسی اثناء میں سر عبدالقادر کو اُردو ادب کی خدمت کا شوق اور رسالہ "مخزن" جاری کرنے کا خیال ہوا۔ سر عبدالقادر سے اقبال کے دوستانہ تعلقات قائم ہو چکے تھے اور اس سے فائدہ اُٹھا کر انہوں نے اقبال کو منظر عام پر آنے کی دعوت دی۔ مگر انہوں نے عذر کیا کہ کوئی نظم اس وقت تیار نہیں ہے۔ سر عبدالقادر نے "ہمالہ" والی نظم کا مطالبہ کیا اور جوں توں کر کے حاصل کر ہی لی۔ مخزن کی پہلی جلد کے پہلے نمبر میں (اپریل ۱۹۰۱ء) یہ نظم شائع ہوئی۔ اس کے بعد سے اقبال کا یہ گویا معمول سا ہو گیا تھا کہ ہر مہینہ کچھ نہ کچھ مخزن کیلئے لکھتے۔ اقبال کی شہرت پھیلنے لگی اور دوسرے رسالوں اور جریدوں نے بھی دست طلب دراز کئے۔

مُلازمت ایم۔اے پاس کر کے اورنٹیل کالج لاہور میں ملازم ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ افسران کالج اور عہدہ داران تعلیم کی رائے ان کی خدمات اور ان کی لیاقت کے متعلق بہت اچھی تھی۔ علمی مشاغل ان کی زندگی کا جزو لاینفک ہو گئے تھے۔ اکثر طالب علم ان کے مکان پر بھی آیا جایا کرتے تھے اور

کالج کے اوقات کے بعد سلسلہ درس و تدریس برابر جاری رہتا تھا۔ بہت جلد انہوں نے بحیثیت ایک شفیق اُستاد کے شہرت حاصل کر لی۔ اسی زمانہ میں اُردو زبان میں ایک کتاب "علم الاقتصاد" لکھی۔

انگلستان میں اعلیٰ تعلیم کا شوق انہیں انگلستان لے گیا۔ کیمبرج یونیورسٹی میں شریک ہوئے اور فلسفہ اخلاق پر ریسرچ کر کے ڈگری حاصل کی پھر جرمنی سے ڈاکٹر آف فلاسفی کی فرسٹ کلاس ڈگری ایک کتاب بنام فلسفہ عجم لکھکر حاصل کی۔ یہ کتاب لندن سے شائع ہوئی۔ بڑے بڑے علماء اور معیاری رسائل و اخبارات نے اس پر عمدہ عمدہ رائیں لکھیں۔ جرمنی سے واپس ہو کر لندن کے اسکول آف پولیٹیکل سائنس میں شریک ہوئے۔ اس ڈگری کے ساتھ ہی ساتھ بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا۔

لندن یونیورسٹی میں پروفیسری اقبال نے اپنی تحقیقات کے نتائج چھ پبلک لکچرز میں بیان کئے جس سے محققین کے گروہ میں ان کی ایک خاص وقعت ہونے لگی۔ یہ لکچرز سب کے سب "اسلام" پر تھے۔ اسلام کے علاوہ اقبال نے مقابلہ کے لئے مختلف مذاہب کا بغور مطالعہ کیا اور بعض مشاہیر سے تبادلہ خیال بھی کیا۔ ان دنوں اقبال کی انگلستان میں کافی شہرت تھی اور انہیں عربی۔ فارسی اور مذہبیات کا عالم مانا جاتا تھا۔ حسن اتفاق سے پروفیسر آرنلڈ کی جگہ چھ ماہ تک قائم مقامانہ حیثیت سے عربی کے پروفیسر ہونے کا زرین موقع ملا۔

زمانہ قیام یورپ میں شاعری زمانہ قیام یورپ میں اقبال نے بہت کم نظمیں لکھیں۔

یہ زمانہ عنفوان شباب کا تھا جبکہ خواب وخیال کی دنیا کا حسن وجمال جو طفلی کے زمانہ کی مخلوق ہے دل کی پرشوق آرزو کا آب ورنگ بنتا ہے اور پھر یہ جذبہ قلب کی گہرائیوں سے نکل کر مادّی اشیاء کے ساتھ متحد ہو جانا چاہتا ہے۔ اس دور کی شاعری پر محبت کے گھناونے بادل منڈلاتے نظر آتے ہیں۔ ان کی نظم "..... کی گود میں بلّی کو دیکھکر" اسی قسم کی ایک اچھی مثال ہے۔ معشوق مجازی سے وصل کی خواہش اور ہجر کا غم۔ قربت سے لذّت اور جدائی میں تڑپ محسوس کرنا اس دور کی نمایاں خصوصیت ہے پھر قدرتی مناظر میں بھی معشوق مجازی کے خط وخال تلاش کرنا فطرت کے حسن کو مجازی کے حسن پر منطبق کرنا شاعر کے جوش کی انتہا ہے لیکن اس کے بعد میں ایک دور ایسا آتا ہے جب کہ مجاز سے حقیقت کی طرف شاعر کی روح پرواز کرنے لگتی ہے وہ مجاز کو حقیقت کا وسیلہ قرار دیکر سعی وجستجو شروع کرتا ہے۔ جب اقبال اس دور سے گذرے تو انہوں نے سوامی رام تیرتھ کی یاد میں ایک نظم لکھی یہ وہی ہستی ہے جس نے امریکہ میں مشرق کا پیغام پہنچایا۔ علاوہ اس کے دوسری نظموں مثلاً سلیمیٰ۔ کلی۔ تنہائی اور "دریائے نیکر کے کنارے ایک شام" سے بھی پتہ چلتا ہے کہ شاعر مجاز سے حقیقت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ جب ان خیالات کا ہجوم ہوتا ہے تو مغرب کی مادیت سے شاعر کو گھن آنے لگتی ہے اور وہ پکار اُٹھتا ہے:۔

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

دیار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

کہا جو قمری سے میں نے اک دن یہاں کے آزاد پا بگل ہیں
تو غنچے کہنے لگے ہمارے چمن کا یہ رازدار ہوگا

نہیں ہے غیر از نمود کچھ بھی جو مدعا تیری زندگی کا
تو اک نفس میں جہاں سے مٹنا تجھے مثالِ شرار ہوگا

کیا مرا تذکرہ جو ساقی نے بادہ خواروں کی انجمن میں
تو پیر میخانہ سن کے کہنے لگا کہ منہ پھٹ ہے خوار ہوگا

پہلے سفر یورپ کی یہ آخری نظم ہے اسی لئے اس کو رخصتی پیغام کہا جاتا ہے۔

تصانیف اقبال نے سب سے پہلے اردو میں علم الاقتصاد کے نام سے ایک کتاب لکھی جو آج کل کم یاب ہے۔ انگلستان میں "فلسفہ عجم" پر انگریزی میں ایک کتاب لکھی۔ انگلستان سے واپس ہو کر اسرار خودی اور رموز بے خودی کے نام سے دو مثنویاں شائع کیں۔ پھر "بانگ درا" کے نام سے اپنے اردو کلام کا مجموعہ شائع کیا۔ اس کے بعد پیام مشرق اور زبور عجم شائع کیں۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں مدراس اور حیدر آباد میں جو چھ تقریریں انگریزی زبان میں پڑھیں اس کو کتابی صورت میں یکجا شائع کیا اس کے بعد "جاوید نامہ" لکھا اور حال ہی میں "بال جبریل" اور "ضرب کلیم" کے نام سے باقی اردو کلام کے مجموعے ترتیب دئے۔

دوسری زبانوں میں کلام اقبال کے ترجمے حسین دانش نے ترکی زبان میں اقبال کی بہت سی نظمیں ترجمہ کیں اور پیام مشرق پر تبصرہ لکھا۔ ڈاکٹر توفیق کا خیال ہے کہ اقبال کے نظریات کو حسین دانش نے نہایت وضاحت سے بیان کیا ہے اور ان کی عظمت کو اس شان سے پیش کیا ہے کہ اگر وہ کبھی قسطنطنیہ آئیں تو عوام و خواص دونوں ان کا پرتپاک خیر مقدم کریں گے۔

افغانستان میں آغا ہادی حسن نے اقبال کو روشناس کرایا اور پیام مشرق پر بسیط تبصرہ لکھا۔

احمد رفعت نے اقبال کی بہت سی نظموں کا ترجمہ عربی میں کیا اور مصر کے مشہور جریدہ الاحرام میں شائع کیا۔

عبدالحق بغدادی مرحوم نے "ترانہ" کا ترجمہ عربی میں کیا تھا۔

ڈاکٹر شورو کر نے پیام مشرق کے مقدمہ کو جرمن میں منتقل کیا اور اس کی غرض وغایت کو خوب واضح کیا۔

ڈاکٹر فشر پرفیسر لیپزگ یونیورسٹی نے جرمن میں پیام مشرق پر تبصرہ لکھا جس میں گوئٹے اور اقبال کا مقابلہ کیا۔

جرمنی کے مشہور مستشرق ڈاکٹر ہانسی ماٹنکے نے پیام مشرق کے ایک حصہ کا ترجمہ جرمن میں کیا اور چمڑے پر اپنے ہاتھ سے لکھکر مشرقی انداز میں نقش ونگار سے آراستہ وپیراستہ کرکے اقبال کی خدمت میں بطور ہدیہ ارسال کیا۔

ایطالیہ کے مشہور فاضل ڈاکٹر اسکاریہ نے ایطالیہ کے ایک ادبی مجلہ میں اقبال کے متعلق ایک محققانہ مقالہ لکھا۔

حال ہی میں جرمنی سے ایک بیاض ہندوستانی علم ادب کے متعلق شائع ہوئی ہے جس میں مختلف شعرا کے کلام کا انتخاب بصورت ترجمہ درج ہے۔ اس مجموعہ میں اقبال کی پانچ نظمیں ہیں۔

ایک مشہور روسی سیاح نے اقبال کے اشعار سے متاثر ہوکر بعض نظموں کو روسی زبان میں منتقل کیا۔

کلام اقبال پر ہربرٹ ریڈ کی تنقید جب پروفیسر نکلسن نے اقبال کی اسرار خودی کا ترجمہ کیا تو ہربرٹ ریڈ نے مغربی شعرا۔

کلام سے اس کا موازنہ کرتے ہوئے اقبال پر والٹ وھیمٹن کے فلسفہ اقدام و عمل کا اثر دکھایا تھا۔ وہ لکھتا ہے :-

وھیمٹن کا نصب العین اس اعتبار سے بہت اہمیت رکھتا ہے کہ وہ نظری نہیں بلکہ عملی ہے۔ صرف ایک شاعر ایسا ہے جس کے ہاں یہ چیز نظر آتی ہے اور وہ بھی ہماری نسل اور قوم سے نہیں۔ میری مراد محمد اقبال سے ہے جن کی نظم اسرار خودی کا ترجمہ ڈاکٹر رینالڈ نکلسن نے کیا ہے اور میکملن کے اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ ہمارے ملک کے شاعر تو کیٹس کے زمانہ کی پرانی لکیر پیٹتے ہیں اور بلیوں کتوں اور پرندوں یا دوسرے چھوٹے چھوٹے موضوعات پر نظمیں لکھتے ہیں برخلاف اس کے لاہور میں ایک ایسی نظم شائع ہوئی ہے جس نے ہندوستان کے مسلمان نوجوانوں پر پوری طرح تسلط کر لیا ہے۔ ایک نوجوان مسلمان لکھتا ہے "اقبال اس عہد کا مسیح ہے جس کی آتش نفسی نے مُردوں کو زندہ کر دیا"۔ تم پوچھو گے کہ آخر اس میں کونسی ایسی ظاہری کشش ہے جس نے لوگوں کے دل اپنی مٹھی میں کر لئے اس کا جواب یہ ہے کہ یہ معجزہ اس قسم کی کسی ظاہری کشش کا رہین منت نہیں جو مبلغوں اور دنیا کو نجات کا پیغام دینے والوں کے لئے مخصوص ہے۔ یہ اعجاز ایک نظم نے

دکھایا ہے جس کے حسن و جمال کے آئینے میں فلسفہ جدید کے اکثر پہلو منعکس نظر آتے ہیں۔ اس میں خیالات کی فراوانی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان میں بلا کا ربط ہے۔ اسی لئے اس کی منطق ساری کائنات کے لئے آواز غیب کا حکم رکھتی ہے۔"

اقبال کا فلسفہ

اقبال اپنے ایک خط میں ڈاکٹر نکلسن کو لکھتے ہیں:۔

"بعض انگریز تنقید نگاروں نے اس سطحی تشابہ اور تماثل سے جو میرے اور نیٹشے کے خیالات میں پایا جاتا ہے دھوکہ کھایا ہے۔ وہ انسان کامل کے متعلق میرے تخیل کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے غلط بحث کر کے میرے انسان کامل اور جرمن مفکر کے فوق الانسان کو ایک ہی چیز فرض کر لیا۔ میں نے انسان کامل کے متصوفانہ عقیدے پر اس وقت قلم اٹھایا تھا جب کہ نہ تو نیٹشے کے عقائد کا غلغلہ میرے کانوں تک پہنچا تھا اور نہ اس کی کتابیں میری نظروں سے گذری تھیں۔

"میں روحانی قوت کا تو قائل ہوں لیکن جسمانی قوت پر یقین نہیں رکھتا۔ جب ایک قوم کو حق و صداقت کی حمایت میں دعوت پیکار دی جائے تو میرے عقیدے کی رو سے اس دعوت پر لبیک کہنا اس کا فرض ہے لیکن میں ان تمام

جنگوں کو مردود سمجھتا ہوں جن کا مقصد محض کشور کشائی اور ملک گیری ہو۔

"نیٹشے بقائے شخصی کا منکر ہے۔ جو اشخاص حصول بقار کے آرزو مند ہیں وہ اُن سے کہتا ہے کیا تم ہمیشہ کیلئے زمانہ کی پشت کا بوجھ بنے رہنا چاہتے ہو؟ اس کے قلم سے یہ الفاظ اس لئے نکلے کہ زمانہ کے متعلق اس کا تصوّر غلط تھا۔ اس نے کبھی مسئلہ زمان کے اخلاقی پہلو کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ بخلاف اس کے میرے نزدیک بقا، انسان کی بلند ترین آرزو اور ایسی متاع گرانمایہ ہے جس کے حصول پر انسان اپنی تمام قوتیں مرکوز کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں عمل کی تمام صور و اشکال مختلفہ کو جن میں تصادم و پیکار بھی شامل ہے ضروری سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک ان سے انسان کو زیادہ استحکام و استقلال حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ اس خیال کے پیش نظر میں نے سکون و جمود اور اس نوع کے تصوف کو جس کا دائرہ محض قیاس آرائیوں تک محدود ہو مردود قرار دیا ہے۔"

اپنی انفرادی ہستی کو قائم رکھو

اقبال کا پیغام یہ نہیں ہے کہ انسان کا اخلاقی اور مذہبی فرض ہے کہ وہ اپنی

ہستی کو مٹا دے یا اپنی خودی کو فنا کر دے۔ برخلاف اس کے وہ اپنی انفرادی
ہستی کو قائم رکھنے کا درس دیتے ہیں۔ اور اس کے حصول کا طریقہ ان کے
خیال میں یہ ہے کہ وہ اپنے اندر بیش از بیش انفرادیت اور یکتائی پیدا کرے

حیات کیا ہے؟ اقبال کے نزدیک حیات کا دوسرا نام فرد ہے اور فرد کی اعلیٰ ترین صورت جو اس وقت تک متحقق ہو سکی ہے آگے
چل کر ایک مستقل بالذات مرکز بن جاتی ہے۔ جسمانی اور روحانی دونوں پہلوؤں
سے انسان ایک مستقل بالذات مرکز ہے لیکن وہ ابھی تک "فرد کامل" نہیں ہے
فرد جس قدر خدا سے دور ہوگا اس قدر اس کی انفرادیت ناقص اور کمتر درجہ
کی ہوگی اور جس قدر وہ خدا سے قریب ہوگا اسی قدر کامل انسان ہوگا۔

جدوجہد جامۂ انسانیت میں آکر حیات شخص کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور یہ صورت مسلسل جدوجہد سے باقی رہتی ہے اور اگر یہ حالت
قائم نہ رہے تو لامحالہ تعطل یا ضعف کی حالت طاری ہو جائے گی چونکہ شخصیت
انسان کا سب سے بڑا کمال ہے اس لئے اس کا فرض ہے کہ وہ اس جوہر
بے بہا کو مسلسل سرگرم عمل رکھے اور معطل نہ ہونے دے کیونکہ جدوجہد میں زندگی
ہے اور جو شے شخصیت کو پیہم جدوجہد کی طرف راغب کرتی ہے وہ در اصل ہمیں
بقائے دوام کے حصول میں مدد دیتی ہے گویا شخصیت کا تصور اشیائے کائنات
کے حسن و قبح کا معیار ہے اسی بنا پر خیر و شر کا مسئلہ بخوبی حل ہو سکتا ہے جو شے
شخصیت کو توانائی عطا کرتی ہے اچھی ہے اور جو اسے کمزور کرے بری ہے۔

نصب العین انسان کا نصب العین بجائے زندگی کے موت کو قرار دینا

ایک غلطی ہے اور یہ غلطی انسان کو بزدلی سکھاتی ہے مادہ کو زندگی کی راہ میں ایک سنگ گراں سمجھ کر اس سے گریز کرنا نہ چاہیئے بلکہ جوہر انسانیت یہ ہے کہ ان مخالف قوتوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا جائے اور ان پر غالب آکر انھیں اپنا خادم بنا لیا جائے۔

ماضی کی یاد اقبال اور روسو دونوں ماضی کی یاد میں تڑپتے ہیں۔ اور ان کی انتہائی خواہش یہی ہے کہ ان کے دن پھریں اور وہی دن عید اور رات شب برات کی طمانیت حاصل ہو جو ماضی میں انھیں حاصل تھی روسو اسی تلاش میں فطرت کی طرف واپس لوٹتا ہے اور اقبال عہد نبوی کے خوشگوار روز شب کی جھلک مستقبل میں دیکھنا چاہتے ہیں ان کا دل دکھتا ہے یہ دیکھکر کہ مسلمانوں کی آنکھیں تہذیب حاضرہ کے جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری سے چکا چوند ہو رہی ہیں جس میں تعیش اور ظاہرداری کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اسلام کو اپنی اصلیت پر کس طرح لوٹایا جائے؟ اقبال کہتے ہیں کہ "تاریخ قوم کے لئے وہی کام دیتی ہے جو حافظہ فرد کے لئے۔ اس لئے اگر تاریخ اپنے آپ کو دہرائے تو مسلمانوں کو چاہیئے کہ اس کے خیر مقدم کے لئے تیار رہیں زندگی کو سادہ بنائیں اس میں تصنع۔ فرقہ وارانہ خیالات اور خود غرضانہ خواہشات کا گذر نہ ہو۔ اخلاقی دماغی اور سیاسی بزدلی کو جو آج اسلام کی انفرادی حیثیت سے جڑیں کاٹ رہی ہے دور کریں۔

اقبال اور تصوف اقبال کا خیال ہے کہ تصوف نے اسلامی شاعری اور اسلامی زندگی پر جو ہمہ گیر اثر پیدا کر دیا ہے وہ ہماری ابتدائی قومی روایات کے قطعاً منافی ہے اور ہمارے اخلاقی مذہبی اور سیاسی اغراض و مقاصد کے حق میں

ستم قاتل۔ خودی جس کو صوفیائے کرام مٹانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ انہوں نے سنوارنے اور ابھارنے کی فکر کی۔ صوفی کہتے ہیں کہ اور سب کچھ ہے لیکن ہم کچھ بھی نہیں اقبال کہتے ہیں کہ صرف ہم ہی ہم ہیں اور کچھ بھی نہیں۔ صوفی کہتے ہیں کہ ہماری کائنات ہی کیا ہے۔ ہماری ہستی مستعار شبنم کے ایک قطرے کی مانند ہے کہ جس کو آفتاب حقیقت کی ایک کرن فنا کر دیتی ہے اقبال کہتے ہیں قطروں ہی کے اجتماع کا نام تو بحر ذخار ہے صوفی کہتے ہیں کہ خودی کو چھوڑ دو کیونکہ تمہاری ہستی اور تمہارا وجود تمہارے اور تمہارے محبوب کے درمیان ایک پردہ ہے اور جب تک تم اس پردہ کو اٹھا نہ دوگے اپنے محبوب کے دیدار اور وصال سے محروم رہوگے اقبال کہتے ہیں کہ خودی کو باقی رکھکر محبوب تک اپنے آپ کو پہنچاؤ۔ صوفی کہتے ہیں کہ تگ و دو فضول ہے بس لو لگائے ہوئے چپ سادھو اقبال کہتے ہیں کہ جد و جہد کیے جاؤ کہ یہی شیوہ سنت ہے صوفی کہتے ہیں کہ ہم طالب ہیں اور خدا مطلوب۔ ہم ملک عدم میں تھے کہ ہمارا مطلوب ہم سے جدا ہو گیا اس گم شدہ محبوب کی تلاش میں ہم عدم سے وجود میں آئے اقبال کہتے ہیں کہ خدا طالب ہے اور ہم مطلوب۔

اقبال کا فلسفہ خالص اسلامی ہے

اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کے فلسفیانہ خیالات گوئٹے۔ برگساں اور نیٹشے سے اکثر جگہ ملتے جلتے ہیں مگر یہ بھی ضرور ہے کہ بعض مقامات پر سخت اختلاف ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال کا ماخذ مغربی فلسفہ نہیں ہے بلکہ اسلامی فلسفہ ہے۔ مغربی فلسفہ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اقبال نے اسلامیات اور الٰہیات کا اتنی گہری نظروں سے مطالعہ کیا کہ ان کے دل و دماغ پر اسلامی فلسفہ مسلط ہو گیا۔ خود اقبال ایک جگہ لکھتے ہیں: ۔

"میرا دعویٰ ہے کہ "اسرار" کا فلسفہ مسلمان حکماء کے افکار و
مشاہدات سے ماخوذ ہے اور تو او روقت کے متعلق
برگساں کا عقیدہ بھی ہمارے علماء کے لئے نئی چیز نہیں
قرآن الٰہیات کی کتاب نہیں بلکہ اس میں انسان کی معاش
و معاد کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے پوری قطعیت سے کہا
گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کا تعلق الٰہیات کے ہی
مسائل سے ہے۔ عہد جدید کا ایک مسلمان اہل علم
جب ان مسائل کو مذہبی تجربات اور افکار کی روشنی میں
بیان کرتا ہے جن کا مبدا او رسرچشمہ قرآن مجید ہے تو
اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ جدید افکار کو قدیم لباس
میں پیش کیا جا رہا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ پرانے حقایق
کو جدید افکار کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔"

اقبال کی سیاست اقبال کی سیاست اخوت پر مبنی ہے نہ کہ خود غرضی پر۔ مذہب سیاسی زندگی کا حقیقی پاسباں ہے وطن یا ملک ایک عارضی اور جغرافیائی چیز ہے۔ تاریخی حوادث و واقعات اس کے حدود اور نصب العین کو متواتر بدلتے رہتے ہیں۔ اس کی حالت عارضی ہوتی ہے اور وہ چند صدیوں کیلئے بھی ایک نہج پر قائم نہیں رہتا۔ اقبال کی "ریاست عالمگیر" مذہبی ہے خدائی ہے اور ابدی ہے۔

وہ میکاولی کو "مقامی ریاست" کے خیال کا بانی قرار دیتے ہیں اور اسے

مورد طعن ٹھہراتے ہیں جس نے دنیا کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا اس لئے کہ اس کی تعلیم ڈینٹے اور مارسیلس کے "ریاست عالمگیر" کے خیال کو زائل کرنے اور عیسائیت روما کو صدود اطالیہ میں قائم کرنے پر منتج ہوئی۔ اقبال نہیں چاہتے کہ اسلام ملکوں کی چہار دیواری میں مقید ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔ اور اسی سلسلہ میں جب انہوں نے اسلام کے منتشر شیرازہ کو یکجا کرنے کی کوشش کی تو معترضین نے طعن و طنز کی بوچھاڑ شروع کی کہ اقبال کو نہ وطن سے محبت ہے اور نہ اس کی فکر۔ مگر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بعد معلوم ہو گا کہ اقبال نے کہیں بھی حُبِ وطن کے خلاف ایک لفظ نہیں کہا اور نہ اس کو ایمان اور مذہب کے خلاف بتایا۔ اگر کُل میں جزو شریک ہے تو عالمگیر اخوت میں بھی حُبِ وطن پوشیدہ ہے۔ اگر اقبال "پان اسلامزم" کا درس دیتے ہیں تو اس کے یہ کہاں معنی ہوئے کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے وطن کی محبت سے باز رکھنے کی ترغیب دیتے ہیں ان پر تعصب کا الزام بے بنیاد ہے۔ وہ شاعر ہیں، فلسفی ہیں اور پیغامبر۔ ان کے پیغام کے لئے زمان و مکان کی حدیں مقرر نہیں، ان کا درس مقام کی حصار میں محدود نہیں۔ وہ شاعر اسلام ہیں اور اسلام کا پیغام دنیا کے ہر کھلے ہوئے گوشے تک پہنچانا چاہتے ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ کس طرح نکالا جا سکتا ہے کہ وہ ملک اور وطن کی سیوا نہیں کرتے برخلاف اس کے "ترانہ ہندی" "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" "نیا شوالہ" پر ایک سرسری سی نظر بھی یہ ثابت کر دیگی کہ اقبال اپنے وطن کو کتنا عزیز رکھتے ہیں اور اس کی حالت زار پر کس قدر آنسو بہاتے ہیں:

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھکو \
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

پھر اسی درد بھرے دل سے نصیحت کرتے ہیں ؎

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہد کہن کی داستانوں میں

یہ خاموشی کہاں تک لذت فریاد پیدا کر
زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

اسی نظم (تصویر درد) میں ہندوستان کی بدحالی کو سنوارنے کا عزم صمیم ملاحظہ ہو

ہویدا آج اپنے زخم پنہاں کر کے چھوڑوں گا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا

مگر غنچوں کی صورت ہوں دل درد آشنا پیدا
چمن میں مشت خاک اپنی پریشاں کر کے چھوڑوں گا

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

اپنے وطن کی تعریف "پان اسلامزم" کے علمبردار سے سنئے:۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستان ہمارا

پھر یہ وطن پرست شاعر اپنے وطن کی تعریف میں اس شان سے رطب اللسان ہے۔

یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا — سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا
مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا — ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

بندے کلیم جس کے پربت جہاں کے سینا — نوح نبی کا آ کر ٹھیرا جہاں سفینہ
رفعت ہے جس زمیں کی بام فلک کا زینا — جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

اب بھی اگر کسی کو اقبال کی وطن پرستی پر ایمان نہ آئے تو وہ سنے ؎

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے — خاک وطن کا مجھکو ہر ذرہ دیوتا ہے

کیا اس پر بھی سارے ہندوستانی اقبال کی اس آرزو میں اس کے ہمنوا نہ ہوں گے:۔

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں — بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقش دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی — آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ — دامان آسمان سے اس کا کلس ملا دیں

ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلادیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

اقبال کی شاعری ان کی شاعری کا آغاز اردو زبان میں ہوا اور دوسرے شاعروں کی طرح غزل سے ابتدا کی اس لئے اس زمانہ کے ہر دل عزیز غزل گو داغ سے اصلاح بھی لی۔ لیکن بہت جلد ہی ان کے شعر کی وسعت "تنگ نائے غزل" میں نہیں سما سکی۔ دوسری اصناف شاعری پر نظر پڑی۔ رباعی۔ قطعہ۔ مثنوی۔ مسدس سبھی میں طبع آزمائی کی مگر طبیعت اردو کی کم مائیگی اور شعری لطافتوں کی کمی کی وجہ سے گھبرا گئی اور فارسی زبان کی طرف توجہ کی۔ فارسی کی شیرینی اور قبولیت عامہ نے انھیں گرویدہ کر لیا اور اپنی شہرۂ آفاق مثنویاں سب کی سب اس زبان میں نظم کیں۔ خود کہتے ہیں ؎

گرچہ ہندی در عذوبت شکر است
طرز گفتار دری شیریں تر است
فکر من از جلوہ اش مسحور گشت
خامہ من شاخِ نخل طور گشت
پارسی از رفعتِ اندیشہ ام
درخور با فطرت اندیشہ ام
خوردہ بر مینا مگیر اے ہوش مند
دل بندوق خوردہ مینا بہ بند

انداز بیان ان کا انداز بیان فلسفیانہ ہے۔ طلوع سحر ہو یا نمود شفق۔ کوہسار کا منظر ہو یا سبزہ زار کا بہار کا ذکر ہو یا خزاں کا غم کا وقت ہو یا خوشی کا موقع ہر چیز کو وہ فلسفیانہ نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اور اس میں یکسر محو حیرت ہو کر حقیقت تک پہنچنے کی فکر کرتے ہیں۔ لیکن خوبی یہ ہے کہ فلسفیانہ

خیالات کو شوکت الفاظ۔ روانی اور زور بیان کی مدد سے وہ اس قدر جاذب نظم بنا لیتے ہیں کہ دل پھڑک اٹھتا ہے۔ موج دریا۔ ستارہ۔ بچہ۔ چھوٹی نظموں میں اور طویل نظموں میں شکوہ۔ تصویر درد۔ جواب شکوہ۔ والدہ مرحومہ اور شمع و شاعر اس قسم اچھی مثالیں ہیں خودی کے متعلق شمع و شاعر میں کہتے ہیں:۔

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تو کھیتی بھی تو باراں بھی تو حاصل بھی تو

آہ کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے
راہ تو رہرو بھی تو رہبر بھی تو منزل بھی تو

شعلہ بنکر پھونک دے خاشاک غیر اللہ کو
خوف باطل کیا کہ ہے غارتگر باطل بھی تو

بے خبر تو جوہر آئینہ ایام ہے
تو زمانہ میں خدا کا آخری پیغام ہے

منظر نگاری | جہاں اقبال ادق سے ادق فلسفیانہ مضامین کو سلیس اور شاعرانہ زبان میں نظم کرنے میں کامیاب ہوئے وہاں منظر نگاری میں بھی یدطولیٰ حاصل کیا۔ "ایک آرزو" کے چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو

ہو دلفریب ایسا کوہسار کا نظارا
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو

پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو
سرخی لئے سنہری ہر پھول کی قبا ہو

پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے
رونا مرا وضو ہو نالہ مری دعا ہو

شاعر کو مصور بھی کہا جاتا ہے مصور میں اور شاعر میں صرف ذرائع کا فرق ہے مصور رنگ اور قلم کی مدد سے تصویریں کھینچتا ہے اور شاعر صرف الفاظ ہی پر بھروسہ کرتا ہے۔ منظر نگاری مصوری کی ایک شاخ ہے اور دوسری شاخ صورت گری ہے۔ اقبال کی منظر نگاری کا نمونہ تو اوپر کی مثال ہے اور صورت گری کے لئے ذیل میں ہم "شکوہ" کا ایک بند پیش کرتے ہیں:۔

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز
قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

تاثرات شعر کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ سننے یا پڑھنے والے کے دل پر ایسا اثر کرے کہ وہ بے قابو ہو جائے۔ مشہور ہے کہ دل سے جو بات نکلتی ہے اثر کرتی ہے یا تو خود شاعر کا دل چوٹ کھایا ہوا ہو یا پھر وہ انسانی فطرت کا ایسا نباض ہو کہ اس کی دکھتی ہوئی رگ چھوے۔ اقبال نفسیات کے اس زمرہ سے خوب واقف ہیں اور میر کے نشتروں کی طرح اقبال کے کلام میں بھی بلا کا درد و اثر ہے۔ "پرندے کی فریاد" کے تین شعر سنئے:۔

لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم
شبنم کے آنسوؤں پر کلیوں کا مسکرانا
وہ پیاری پیاری صورت وہ کامنی سی مورت
آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانہ

آتی نہیں صدائیں اس کی مرے قفس میں
ہوتی مری رہائی اے کاش میرے بس میں

اقبال کی ہر دل عزیزی

شاعر کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ماحول کو اپنے مطابق رنگ لے اور مستقبل میں اپنی روح پھونک دے شاعر کا کمال اسی وقت باقی رہ سکتا ہے جبکہ وہ اپنے نقوش قدم پر چلنے والوں کا ایک گروہ پیدا کرے۔ اقبال دور جدید کی اُردو شاعری پر اس قدر حاوی ہیں کہ نوجوان اُردو شعراء ان کی تتبع کو باعثِ فخر و مایہ نازش سمجھتے ہیں بلاشبہ وہ ان کو ہندوستان کے نہیں بلکہ موجودہ دنیا کے بزرگ تریں شاعروں میں شامل کرتے ہیں۔ نہ صرف نوجوان شعرا کے دلوں میں ان کی وقعت ہے بلکہ گرامی مرحوم جیسے کہنہ مشق اور بلند شاعر کو بھی کہنا پڑا کہ ؂

در دیدہ معنی نگہاں حضرت اقبال — پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

قبولیت عامہ کا یہ شرف حیرت انگیز اس وقت ہو جاتا ہے جبکہ یہ خیال گذرتا ہے کہ اقبال نے اپنا بہترین کلام فارسی زبان کی نذر کیا قصیدہ اور غزل جیسی خواص و عوام کو خوش کرنے والی اصناف کو چھوڑا۔ عوام کو سمجھانے کے لئے اپنے تخیل کی بلند پروازی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا بلکہ سرحد ادراک سے پرے ہی پرے اڑا کیا۔ خیال کو زبان کے پنجرے میں بند نہیں کیا پھر بھی شہرت عام اور بقائے دوام کا زریں تاج ان کے سر پر دکھائی دیتا ہے۔

سرکاری حلقوں میں اقبال کی بہت عزت ہے اس کا ثبوت "سر" کا خطاب اور گول میز کانفرنس میں نمائندگی کا اعزاز ہے۔

رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری



رایٹ آنریبل سر اکبر حیدری

رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری

آبا و اجداد محمد اکبر نذر علی حیدری بمبئی میں ۸ نومبر ۱۸۶۹ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان ابتدا سے تجارت پیشہ رہا۔ اور اسی تجارت کے سلسلہ میں ان کے جد عرب سے ہندوستان آئے اور بمبئی جیسے مشہور تجارتی مرکز میں سکونت پذیر ہوئے۔ مگر رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ اس خاندان نے تعلیم کی طرف رخ کیا۔ انگریزی طرز تعلیم سے متمتع ہو کر سیر و سیاحت سے خاطر خواہ فائدہ حاصل کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اکبر حیدری کے والد نے چین کا چھ مرتبہ سفر کیا۔ اور یہ سب اپنے کاروبار کو فروغ دینے کے سلسلہ میں تھا۔ یہ خاندان سادگی اور راست بازی میں اپنی نظیر آپ تھا۔ ان میں ہر فرد سچا مسلمان اور پکّا دیندار تھا اور تجارت بھی اسلامی نقطۂ نظر سے کرتا تھا۔

ابتدائی تعلیم ابتدا ہی سے اکبر حیدری کو مدرسہ میں شریک کرایا گیا۔ باوجودیکہ یہ خاندان بادی النظر میں بہت مذہبی سمجھا جاتا تھا اور بہت لوگوں کو اس کا گمان ہو سکتا تھا کہ اکبر حیدری کی تعلیم ابتدا ہی سے انگریزی اسکول میں ہو گی مگر واقعہ یہ تھا کہ زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ مغربی طرز تعلیم کی اہمیت

ہوتی جارہی تھی اور اکبر حیدری کے والد جو کہ بہت نکتہ شناس اور معاملہ فہم انسان تھے۔ اکبر حیدری کو ابتدا ہی سے انگریزی اسکول میں شریک کرانے کے حامی تھے۔ اس مغربی روش کے باوجود بھی مذہبی تعلیم اور اسلامی عقائد سے اکبر حیدری کو علیحدہ رکھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ بلکہ اس کا خاص طور پر انتظام کیا گیا۔ مدرسہ کی شرکت کے بعد سے انہوں نے درجہ بدرجہ نہایت سرعت کے ساتھ تعلیم کا ابتدائی دور ختم کیا۔ ۱۴ سال کی عمر میں انھوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اور ابھی سترہ سال ختم ہوئے ہی تھے کہ بمبئی یونیورسٹی سے بی۔ اے کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔

اکبر حیدری کی تعلیم بمبئی میں زیادہ تر سینٹ زیویر کالج میں ہوئی دوراں تعلیم میں خواہ وہ ابتدائی جماعتوں میں ہو خواہ اعلیٰ اکبر حیدری کی ذہانت اور فراست کا اندازہ ان کے اساتذہ کو ہو گیا تھا۔ مضامین سے دلچسپی اور ان میں امتیازات حاصل کرنا اگر ان کے تعلیمی انہماک اور ذوق وشوق پر دلالت کرتا تھا تو دوسری طرف ماحول سے واقفیت اور واقعات پر صحیح رائے زنی سے انکی دماغی قابلیت کا پتہ چلتا تھا اور یہی وہ نشانیاں تھیں جنھیں دیکھکر تجربہ کار افراد پیشین گوئی کرتے تھے کہ اکبر حیدری ایک نہ ایک دن بڑے آدمی ہو کر رہیں گے۔

ہوش سنبھالنے کے بعد ہی سے اکبر حیدری کو ہندوستانی مسائل سے دلچسپی ہوگئی اور وہ بمبئی کی اکثر انجمنوں اور جلسوں میں برابر شریک ہوتے تھے۔ ملک اور قوم کی خدمت کا خیال یہیں سے پیدا ہوا اور وہ برابر دل و دماغ میں پرورش پاتا رہا۔ انہوں نے اپنی کالج کی زندگی کے زمانہ میں اکثر و بیشتر مباحثوں اور تقریروں میں

حصہ لیا۔

اِن کے دونوں چچاؤں جسٹس طیب جی اور حاجی نجم الدین طیب جی کو مشرقی علوم سے بڑی دلچسپی تھی۔ اور ان کا خانگی وقت اکثر انھیں کی نذر ہوتا تھا۔ اکبر حیدری کی بڑھتی ہوئی استعداد نے ان لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور انہوں نے خاص طور پر نگرانی شروع کی۔ حیدری کے مطالعہ کے لئے وہ کتابوں کی سفارش کرتے تھے اور مطالعہ کے بعد اُن پر تبادلہ خیال ہوتا تھا اس طرح اکبر حیدری نے مشرقی علوم پر نہ صرف ایک سرسری نظر ڈالی بلکہ اپنے چچاؤں کی بدولت ان پر تبصرہ بھی کرنے کا موقع ملا۔

اکبر حیدری کو نجم الدین سے اتنا اُنس ہوگیا کہ اُنہوں نے اُن کی لڑکی سے شادی کرلی۔

سرکاری ملازمت کی ابتدا

بی۔ اے کامیاب کرنے کے بعد اُن کے والد اور چچا کا خیال ہوا کہ انھیں "انڈین فینانشل" مقابلہ میں شریک ہونا چاہیئے۔ حالانکہ اکبر حیدری کو یہ شعبہ زیادہ پسند نہ تھا لیکن عزیزوں کے اصرار پر انکار ناممکن ہوگیا۔ اور اکبر حیدری نے فوراً ہی اپنی مرضی کے خلاف اپنے خاندان کی خوشنودی کی خاطر مقابلہ میں شرکت کی۔ مقابلہ کی تیاری کا حال اس بد دلی سے واضح ہوسکتا ہے۔ لیکن اکبر حیدری کو کچھ عرصہ بعد یہ دیکھکر تعجب ہوا کہ ان کا نام منتخب امیدواروں میں سرفہرست ہے۔ اب تو اکبر حیدری مجبور تھے کہ اپنا عندیہ چھپائیں اور محکمۂ فینانس کی خدمت پر کمر کس لیں۔ ان کی عمر ابھی اٹھارہ سال ہی کی تھی کہ وہ ملازمت کے سلسلہ میں منسلک کردیے گئے۔ ملازمت کے

سلسلہ میں انھیں ابتداء میں ناگپور، لاہور، کلکتہ، الہ آباد۔ اور مدراس جانا پڑا۔ چند سال بعد گورنمنٹ پریس کے حسابات کی جانچ پڑتال کے لئے انھیں مامور کیا گیا۔ کام پیچیدہ تھا اور ایک تجربہ کار عہدہ دار کی ضرورت تھی لیکن اکبر حیدری کی چند سالہ کارگزاری حکومت کو اتنی پسند ہوئی کہ یہ اہم کام ان ہی کے تفویض کیا گیا۔ ہندوستان کے اکثر مقامات کا دورہ کر کے حیدری نے جو رپورٹ اور جو تجاویز پیش کیں وہ اتنی ضروری خیال کی گئیں کہ فوراً ہی حکومت نے ان کو عملی جامہ پہنایا اور آج تک حکومت ہند میں یہی طریقۂ کار رائج ہے۔

اس سفر کے دوران میں اکبر حیدری نے دیکھا کہ بھارت ماتا کے افلاس کا کیا عالم ہے اور اس کے جاہل سپوتوں کی کیا حالت ہے۔ جہالت کی وجہ سے رسم و رواج کی زنجیروں میں مردِ ہندوستانی جکڑا ہوا ہے۔ طریقۂ کار سے ناواقفیت سبب ہے۔ راہ روی پر ضد اور اصرار، ذرائع آمدنی سے لاعلمی اور بے جا اسراف پر ہٹ دھرمی ہندوستان کے ان گنت افراد کو قعرِ مذلت میں گرانے کا باعث ہیں۔ یہی وہ مشاہدات تھے جن کی بنا پر ماہر مالیات نے ہندوستانی افلاس کا سبب جہالت بتایا۔ اور اسی زمانہ سے اکبر حیدری کو تعلیم کے وسیع ذرائع پر غور کرنے کا موقع ملا۔ اس ضمن میں یہ سوال بھی معرضِ بحث میں آیا کہ ہندوستان کے مخصوص ماحول کے لئے کس طرز اور کس طریقہ کی تعلیم موزون ترین ہے۔ اس موضوع پر اکبر حیدری نے جس قدر وسیع النظری سے مشاہیر ہند سے تبادلۂ خیال کیا، اس کی بنا پر اکثر و بیشتر مصلحان تعلیم اور رہنمایان قوم کو اکبر حیدری کے اشتراک عمل کا خیال پیدا ہوا گوکھلے نے اکبر حیدری کو سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کے ممبر بننے کے لئے دعوت دی اور ان کو اس موضوع پر زیادہ غور و فکر اور تبادلہ خیال کے لئے آمادہ کیا لیکن

ان ہی دنوں حکومت نظام نے اکبر حیدری کے خدمات حاصل کرلئے اور بظاہر لوگوں کو یہ اندیشہ ہوا کہ ریاست کی چہار دیواری میں گھر اکبر حیدری کو شاید ہندوستان کے عام مسائل پر نظر ڈالنے اور تنقید کرنے کا موقع نہ ملے۔اسی لحاظ سے اکثروں نے مخالفت بھی کی لیکن انھیں معلوم نہ تھا کہ اکبر حیدری کی وسیع النظری محصور نہیں کیجاسکتی وہ حیدرآباد میں رہ کر بھی سارے ہندوستان کا درد اپنے دل میں محسوس کرسکتے ہیں ریاست کے فرائض انجام دیکر بھی حکومت ہند کے عام مسائل پر غور و فکر کے لئے وقت نکال سکتے ہیں۔

حیدرآباد میں حیدری

۱۹۰۵ء میں حیدرآباد کے وزیر مالیات سر جارج کیسن واکر تھے۔ انھیں اپنے وسیع اسکیم کو عملی جامہ پہنانے اور آگے بڑھانے کے لئے ایک ہوشیار اور تجربہ کار ماہر مالیات کی ضرورت تھی۔ ایسے موقع پر حکومت حیدرآباد کی نظر اکبر حیدری پر پڑیں اور انھیں واکر کے معاون کی حیثیت سے حیدرآباد بلالیا گیا۔صدر محاسبی کی خدمت ان کے تفویض ہوئی اور مالی اصلاحات کے نظام العمل کو عملی جامہ پہنانے کیلئے اکبر حیدری کی مدد درکار ہوئی۔ اس زمانہ میں ریاست کی مالی حالت کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔ اس کا سبب زیادہ تر فنی نقطۂ نظر سے مالیات کی تشکیل اور آمدنی اور خرچ کے توازن کی عدم موجودگی تھی۔ واکر نے اکبر حیدری کی مستعدی اور فنی چابکدستی کو اس قدر پسند کیا کہ دو سال بعد انھیں فینانس کی معتمدی کا عہدہ حاصل ہوگیا۔ اور یہ اعتماد رفتہ رفتہ اتنا بڑھا کہ ۱۹۰۸ء میں جب واکر رخصت لے کر انگلستان گئے تو محکمۂ مالیات کی عنانیں اکبر حیدری کے ہاتھوں میں دیدی گئیں۔ اس موقع سے انہوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور ریاست کی فلاح و بہبود کے وہ

وہ طریقہ عمل میں لائے کہ عام طور پر حکومت حیدر آباد کی نظروں میں اکبر حیدری کی ایک خاص وقعت ہوگئی. ان دنوں قحط کا بار بار ریاست کے مختلف مقامات پر تسلط جمانا اس قدر اہمیت اختیار کر چکا تھا کہ اس کو دور کرنے کی تجاویز پر بہت زور دیا جا رہا تھا۔ ایسے وقت میں حیدری نے قحط کے موقعوں پر حکومت کی جانب سے رعایا کی مدد کے لئے ایک معقول رقم ہر سال موازنہ میں سے پس انداز کرنی شروع کی اور دو ایک موقعوں پر یہ کثیر رقم اس آڑے وقت میں اتنی کام آئی کہ ریاست کے گوشہ گوشہ میں اکبر حیدری کی دور اندیشی کے چرچے ہونے لگے۔ دوسرا کارنامہ اس عہد کا تعلیمات کے محکمہ کو وسیع کرنے کی تحریک ہے۔ ایک تعلیماتی مشیر مقرر کیا گیا جس کو ہدایات دی گئیں کہ وہ ساری ریاست کا دورہ کر کے تعلیمی حالات کے متعلق ایک جامع رپورٹ پیش کرے اور جب یہ کام انجام پا چکا۔ تو حسب مشورہ تعلیمات کے محکمہ پر زیادہ روپیہ صرف کرنیکی اکبر حیدری نے تحریک کی اور ایک کثیر رقم موازنہ میں اس کے لئے فراہم کی۔ تعلیم ذکور کے ساتھ تعلیم اناث کا بھی اکبر حیدری کو ابتدا ہی سے خیال تھا محبوبیہ گرلز اسکول کی ترقی میں اکبر حیدری کی توجہ کو بڑا دخل ہے۔ تیسری قابل ذکر اصلاح حکومت کے لئے عمدہ عہدہ داروں کا انتخاب ہے اکبر حیدری نے حکومت ہند کی طرح حیدر آباد سول سروس کے قیام پر اس قدر زور دیا کہ سول سروس کی بنیادیں مستحکم ہوگئیں۔ امتحان مقابلہ اور اس کے قوانین وضوابط بالکل حکومت ہند کی طرح رکھے گئے۔ رفتہ رفتہ یہ انتخاب اتنا وسیع ہوتا گیا کہ ریاست کا نظم ونسق لایق اور تجربہ کار سیویلیوں کے ہاتھوں میں آ گیا۔ چوتھی کارگذاری موسٰی ندی کی طغیانی کے احتمال کو کم سے کم کرنا ہے۔ ڈرینج اور آرائش بلدہ کے

قابل لحاظ اسکیموں پر توجہ کرنے کی سفارشیں کیں۔ یہ سفارشات اس قدر واجبی اور ضروری تھیں کہ ان پر حکومت کو متوجہ ہونا لازمی تھا۔ گذشتہ طغیانی نے حیدرآباد میں تاریخی انتشار پیدا کر دیا تھا اور موسم باراں میں اس کی ہولناکی کا دوبارہ امکان تھا اور محض اس امکان کے خیال سے ان افراد کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے جنھوں نے پچھلی طغیانی میں مصیبت جھیلی تھی۔ اس لئے اس کا سد باب ضروری تھا۔ ڈرینج بھی شہری زندگی اور صحت اور صفائی کے اصولوں کے لحاظ سے اس لائق تھا کہ اس پر توجہ کی جاتی۔ چنانچہ فوراً ہی ایک محکمہ معتمدی ڈرینج کے نام سے قائم کیا گیا کہ سارے شہر میں ڈرینج کا جال پھیلا دیا جائے اور صحت عامہ کے بہتر کرنے میں لوگوں کی مدد کیجائے۔ آرائش بلدہ کا سوال بھی اتنا ہی اہم تھا۔ حیدرآباد ایک پرانا شہر ہے اور جا بجا قدیم تاریخی مقامات اور نشانیاں دیکھنے میں آتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ بعض محلے اور مقامات اس قدر گنجان اور اصول حفظان صحت کے لحاظ سے اس قدر خراب تھے کہ ان کی وجہ سے طاعون وغیرہ کی قسم کی بیماریوں نے شہر کو گھیر لیا تھا۔ اس کا ایک ہی طریقہ تھا اور وہ پرانے محلوں کو جو گنجان اور بند اور تاریک تھے توڑ کر از سر نو خاص طور پر تعمیر کرایا جاتا۔ جہاں اس سے یہ فائدہ ہوا کہ ان محلوں کی آب و ہوا میں خاص فرق ہو گیا وہاں یہ بھی ہوا کہ محلہ کی رونق نئے مکانوں سے دو بالا ہو گئی۔ غرض یہ کہ ضرورت تھی کہ تاریخی مقامات چھوڑ کر باقی گنجان مقامات توڑ دیے جاتے اور نیا شہر بسایا جاتا۔ آج اسی کی بدولت حیدرآباد کا شمار ہندوستان کے چوتھے بڑے شہر میں ہوتا ہے۔

ہوم سکرٹیری | ۱۹۱۱ء میں اکبر حیدری ہوم سکرٹیری مقرر ہوئے۔ ان کے تحت

اس وقت پولیس عدالت۔ تعلیمات۔ طبابت وغیرہ جیسے آہم محکمے تھے۔ یہاں انہوں نے سب سے پہلے عدالتی کام کی طرف رُخ کیا اور عدالتوں کی تنظیم اور اُن کی بر وقت کار کردگی پر زیادہ زور دیا خصوصاً تحویل کی کارروائیوں کو بلا تاخیر انجام دینے کا معقول انتظام کیا۔ عدالتی عہدہ داروں کی تنخواہوں اور وجاہت میں اضافہ کرنے کی تحریک پیش کی تاکہ انھیں رشوت لینے یا پاس داری سے حتی الامکان روکا جائے۔ نئے ہائیکورٹ کی عالیشان عمارت کی بنیاد ڈالی۔ طبابت کے محکمہ کو بھی بہت کچھ سنوارا۔ طاعون کی ہلاکت آفرینیوں سے سارا شہر پریشان تھا۔ عوام کے لئے نقل مکان کا بچاؤ ان کی اپنی مفلسی کی بدولت ناقابل عمل تھا اور بغیر نقل مکان کے طبی امداد فضول تھی اس لئے اکبر حیدری نے شہر کے گرد و نواح میں پلیگ کیمپس مستقل طور پر حکومت کی جانب سے بنوادئے جہاں رہکر غرباء بغیر مزید کرایہ کا بار اُٹھائے اپنی جانیں بچا سکتے تھے۔ اس انتظام کے بعد جب طاعون کا دورہ ہوا تو ان کیمپس کی اہمیت اس سے واضح ہوگئی کہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں ان میں مقیم ہو گئے طبابت کے محکمہ میں دوسری اہم تجویز ڈہیلی کے شفاخانہ جذام کی امداد تھی۔ یہ مرض جس قدر مہلک اور تباہ کن ہے وہ ظاہر ہے لیکن اس کے لئے کوئی خاص شفاخانہ نہ تھا اکبر حیدری نے اس کی ضرورت محسوس کی کہ ڈہیلی کے شفاخانہ کے لئے کافی امداد مہیا کرکے اس کو ترقی دی جائے۔

عثمانیہ یونیورسٹی یہ ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ اکبر حیدری کو ابتداہی سے تعلیمات سے دلچسپی رہی ہے۔ محکمہ فینانس میں ملازم رہکر بھی انہوں نے اپنے طور پر تعلیماتی مسائل پر غور و خوض کیا اور حیدرآباد آنے سے پہلے ہی وہ

ہندوستان کی تعلیمی ابتری کو اس کی فلاکت کا سبب سمجھ رہے تھے اس لئے وہ حیدرآباد آتے ہی سب سے پہلے تعلیمات کے نظم و نسق پر نظر کرتے رہے لیکن ابتداء میں ان کی صدر محاسبی اور فینانس کی معتمدی کی مصروفیتیں اس طرف زیادہ توجہ نہ کرنے کا سبب ہوئیں مگر جوں ہی وہ تعلیمات کے معتمد مقرر ہوئے انہیں اس کی فکر دامنگیر ہوئی کہ ریاست کا محکمۂ تعلیمات وسیع اور وسیع تر کیا جائے۔ اکبر حیدری سے پہلے اس محکمہ پر حکومت دس لاکھ روپیہ خرچ کرتی تھی۔ یہ رقم ریاست کی وسعت کا اندازہ کرتے ہوئے بہت قلیل معلوم ہوئی اور اس سے بڑھتی ہوئی ضروریات کی تکمیل نہیں پاسکتی تھی اکبر حیدری نے اسکو دوگنا زیادہ کیا پھر سہ گنا اور چار گنا یہاں تک کہ آج اس کا خرچ کچھ کم ایک کروڑ روپیہ ہے سرکاری مدرسوں کی تعداد اس وقت نوسو (۹۰۰) تھی اور اس کو اکبر حیدری نے بڑھاتے بڑھاتے سوا چار ہزار کے قریب پہنچادیا اور طلباء کی تعداد کو ساٹھ ہزار سے ڈھائی پونے تین لاکھ کردیا۔ محکمۂ تعلیمات کی اس وسعت کے بعد بھی اکبر حیدری کو تشفی نہ ہوئی اور انہوں نے اس بڑی ریاست کے لئے ایک یونیورسٹی کی تحریک پر غور و فکر شروع کیا۔

حیدرآباد کی زبان اُردو ہو چکی تھی اس لئے اس یونیورسٹی کی زبان بھی اُردو تجویز کی گئی۔ اس وقت تک ہندوستان میں کوئی مثال ایسی موجود نہ تھی کہ کسی یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم ملکی زبان ہو۔ گو کہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوستان کے تعلیماتی مسائل پر غور و فکر کرنے والے اصحاب انگریزی زبان کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنانے کے نقائص سے واقف ہو چکے تھے اور اس کے خلاف انہوں نے اکثر موقعوں پر صدائے احتجاج بھی بلند کی تھی مگر کہیں بھی اس نئے

تجویز کو عملی جامہ نہیں پہنایا گیا تھا۔ اسباب کچھ ہی ہوں اور رکاوٹیں کسی قسم کی ہوں مگر باوجود احساس پستی کے کسی یونیورسٹی نے اپنا طرز عمل نہیں بدلا تھا یہ حیدرآباد جیسی عظیم ترین ریاست کے لئے ہی زیبا تھا کہ وہ جرات سے کام لے کر وہاں قدم رکھتی جہاں فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں۔ تعلیمات کے معتمد کی حیثیت سے اکبر حیدری نے یہ نئی تجویز پیش کی اور سلطان العلوم کے معاملہ فہم دماغ اور دور رس نظروں نے جو پہلے ہی سے تعلیماتی مسائل کو سلجھانے اور بکار آمد بنانے پر لگی ہوئی تھیں اس تجویز کے آئینہ میں مستقبل کی شاندار کامیابی دیکھی۔ عثمانیہ یونیورسٹی کی داغ بیل ڈالی گئی تو دنیا کی نظریں اس جرائت آمیز تجربہ پر لگی ہوئی تھیں خود حیدرآباد میں بھی ایک اضطرابی لہر دوڑ رہی تھی مگر آج اسکی حیرت ناک کامیابیوں پر کسے شبہ ہے۔ دارالترجمہ کا قیام ان مشکلات کو حل کرنے کے لئے ہوا جو تراجم کی وجہ سے پیدا ہو رہی تھیں دوسری یونیورسٹیوں کے اساتذہ مصلحان تعلیم۔ اور رجال معاتی کمیشن جب کبھی عثمانیہ یونیورسٹی کے معائنہ کے لئے آتے ہیں تو یہ دیکھکر دنگ رہ جاتے ہیں کہ سائنس کی تعلیم بھی اردو میں دیجاتی ہے اور وہ بھی اعلیٰ اور تحقیقاتی تعلیم بی۔ ایس۔ سی اور ایم۔ ایس۔ سی کی نباتیاتی اور حیوانیاتی شعبہ جات بھی قائم ہو چکے ہیں انجینیرنگ اور طبی کالج بھی نہایت کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں۔ اس نوعیت کی جامعہ کے لئے جدید عالی شان عمارتوں کی بھی شدید ضرورت تھی اور یہ ضرورت بھی آج بڑی حد تک پوری ہو گئی۔ یونیورسٹی کی عمارت کا کام نہایت سرعت کے ساتھ عملی شکل اختیار کر چکا ہے اقامت خانے بن چکے ہیں۔ شعبہ فنون کی عمارت تکمیل کے قریب ہے۔ سائنس کالج

اور دوسری عمارتوں کا کام ہو رہا ہے۔ بلاشبہ جب یہ تعمیری کام بھی ختم ہو جائیگا تو "حیدری کا دماغ اور نظام کی دولت" ٹھکانے لگے گی۔

تعلیمات میں تعصب نہ ہو کلکتہ میں تعلیماتی مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے اکبر حیدری نے ۱۹۱۷ء میں کہا:-

"ہندو اور مسلم یونیورسٹی کے قیام سے یہ اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ کہیں یہ تعصب کی ان چنگاریوں کو جو پہلے ہی سے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل چکی ہیں زیادہ نہ بھڑکائیں لیکن مجھے توقع ہے کہ اس قسم کی یونیورسٹیوں کا جہاں یہ فرض ہے کہ وہ اپنے کلچر کے محاسن کو باقی رکھیں وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ہندوستان کی ساری قوموں کے تمدنوں کو مجموعی حیثیت سے بھارت ماتا کے چرنوں میں رکھدیں۔ یہی وہ طریق عمل ہے جس پر گامزن ہوکر ہندوستان کے نوجوان جن کے ہاتھوں میں اُس کا مستقبل ہے ایک ایسے محاذ پر کھڑے ہو سکتے ہیں جو حقیقی معنوں میں ہندوستانی ہے۔"

جامعات کو سیاسی اکھاڑے نہ بنایا جائے سنہ ۱۹۲۰ء میں جب "نان کوآپریشن" کا زور ہوا تو علی برادروں نے علی گڈھ کی جامعہ کو سیاسی کاروبار کا مرکز بنانا چاہا لیکن اکبر حیدری اور نواب صاحب بھوپال کی انتھک کوششوں نے اس سے باز رکھا "جامعات کو سیاسی اکھاڑے نہ بنایا جائے" اکبر حیدری نے کہا "طلباء کی ذہنیت میں

انقلاب پیدا کرنا مصلحت کے خلاف ہے اور ہندوستانی حالات کا انداز کرتے ہوئے خطرناک"۔ غالباً اکبر حیدری کو اس وقت یاد آیا ہو گا کہ کس طرح بنگال کونسل آف نیشنل ایجوکیشن ٹوٹ گئی اور کس طرح ڈاکٹر اینی بسینٹ کے نیشنل انسٹی ٹیوشن نے حکومت سے امداد کی درخواست کی۔ قومی اور سیاسی اداروں کی شکست دیکھکر جامعات کو دوبارہ کانٹوں میں گھسیٹنا بے سود تھا اس لئے اکبر حیدری نے علی برادروں کی اس تحریک کی سخت مخالفت کی اور جہاں تک آج کہا جا سکتا ہے اس کو تباہی سے بچایا۔

ماہر تعلیمات اکبر حیدری کی تعلیماتی سعی سارے ہندوستان سے خراج تحسین حاصل کر رہی ہے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی نے اعزازی ممبر بنایا عثمانیہ اور مدراس یونیورسٹیوں کے علاوہ دوسری یونیورسٹیوں نے بھی ال۔ ال۔ ڈی کی اعزازی ڈگری دی۔ پنجاب کے علاوہ دیگر یونیورسٹیوں نے جلسہ تقسیم اسناد کے مواقع پر خطبہ صدارت کے لئے مدعو کیا۔ اس سلسلہ کا سب سے بڑا اعزاز غالباً وہ تھا جبکہ "یونیورسٹیز کانفرنس" نے انھیں "انٹر یونیورسٹی بورڈ" کا صدر منتخب کیا۔

ہندوستان کے بہت بڑے وزیر مالیات ۱۹۱۹ء میں حیدرآباد میں جب اگزیکٹو کونسل کا قیام ہوا تو اکبر حیدری کو صدر المہام فینانس کی حیثیت سے ممبر مقرر کیا گیا۔ مالیات کی محکمہ وار تقسیم اکبر حیدری کا بڑا کارنامہ ہے۔ یہاں انہوں نے رفتہ رفتہ بجٹ کی ترتیب میں وہ کار نمایاں کئے کہ ان کا شمار ہندوستان کے بہت بڑے وزیر مالیات میں ہونے لگا۔ سب سے زیادہ قابل تعریف بات یہ ہے کہ جب سے انہوں نے مالیات کا صیغہ اپنے قبضہ میں لیا کبھی بھی

ریاست کے مالیات میں خسارہ نہیں ہوا۔ خصوصاً پچھلے چند سالوں میں بھی جو کہ دنیا کی تاریخ میں مالیاتی نقطہ نظر سے کٹھن گذرے ہیں ان ہی کی چابکدستی کی بدولت ریاست کا مالیاتی محکمہ اس عالمگیر نقصان سے بچا رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے بڑے بڑے ماہران مالیات اکبر حیدری کی اس کارگذاری کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ انکم ٹیکس یا اسی قسم کے بے شمار ٹیکس جن کو ساری دنیا کی ریاستوں میں رائج کرنا پڑا حیدرآباد میں غیر ضروری سمجھے گئے۔ ٹیکس کے علاوہ کروڑ گیری کے محاصل بھی مجموعی حیثیت سے پانچ فیصدی سے بڑھنے نہ پائے۔ دراصل یہی وہ نعمتیں ہیں جن کی وجہ سے حیدرآباد کا شہری برطانوی ہند یا دوسری ریاستوں کے شہری سے زیادہ خوش و خرم ہے۔

نظام اسٹیٹ ریلوے ابتداء میں ریلوے کا گتہ انگریزی کمپنی کے قبضہ میں تھا لیکن حال ہی میں ریلوے خرید لی گئی اور اب ریاست کی ملک ہے جس زمانہ میں انگریزی گتہ تھا اکبر حیدری ریاست کی طرف سے نگراں کار تھے اور لندن کے بورڈ میں یہ نمائندگی کرتے تھے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ اعزاز اس سے پہلے کسی ہندوستانی کو حاصل نہ ہوا تھا۔ اب جبکہ ریاست کی ریلوے ہوگئی اس کا صیغہ بھی اکبر حیدری کے تحت کر دیا گیا۔

ہندو مسلم اتحاد ابتداء ہی سے اکبر حیدری تعصب اور فرقہ وارانہ ذہنیت سے پاک رہے ہیں۔ آج اگر ہندو مسلم اتحاد کی آواز بلند کی جائے تو کوئی تعجب نہیں کیونکہ ہم میں سے ہر شخص یہ جاننے لگا ہے کہ ہماری کامیابی کا اصلی راز اسی اتحاد میں پوشیدہ ہے مگر آج سے ایک عرصہ پہلے جبکہ آزادی کا خیال

پیدا ہوا ہی تھا۔ یہ تاڑ جانا کہ ہندو مسلم نفاق کی بدولت ہم روز بروز قعر مذلت کی طرف بڑھتے جائیں گے عقل سلیم کا کام تھا۔ اکیسویں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، میں جو کلکتہ میں منعقد ہوئی تھی لیکن اکبر حیدری نے کہا:

"ہندوستانی قومیت اس سے ابھرے گی نہیں بلکہ مٹے گی اگر مسلمانوں نے اشوک کی عظمت کا اندازہ نہیں کیا یا چندر گپت کے عہد زرین سے استفادہ نہیں کیا یا اجنٹا کی بت تراشی اور مصوری کے نقوش اپنے دلوں پر مرتسم نہیں کئے یا جیا دیو اور تکارام کی وجد آفرین نظموں سے اپنے سوئے ہوئے جذبوں کو نہیں بیدار کیا یا سری کرشنا اور بدھ کے اخلاقی درس سے اکتساب فیض نہیں کیا۔

"بالکل اسی طرح ہندوستانی قومیت ابھرے گی نہیں بلکہ مٹے گی اگر ہندوؤں نے مغلیہ اور عادل شاہی فلک بوس عمارتوں پر فخر نہ کیا یا شیر شاہ اور اکبر اعظم کے کارنامے تاریخ میں دیکھکر آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لی یا ہندوستان کی ممتاز ترین عورتوں چاند بی بی اور نور جہاں کا احترام نہ کیا یا محمود گاوان اور ابوالفضل جیسے مدبروں کی وزارت کو بھلا دیا یا امیر خسرو اور غالب کی شاعری کو ٹھکرا دیا۔

"وہ دن منحوس ہوگا جبکہ ہندو اور مسلمان میو اور رپن جیسے اعلیٰ درجہ کے ویسرائیوں کا احترام نہ کریں گے یا ماہر ان

نظم و نسق کے سلسلہ میں منرو اور الفنسٹن کا ذکر نہ کریں گے،
ہندوستان کے دوستوں میں فاسٹ اور برائٹ کو فراموش
کر دیں گے۔"

گول میز کانفرنس | ۱۹۳۰ء میں جب گول میز کانفرنس کی تجویز ہوئی تو حیدرآباد سے ایک وفد بھیجا گیا جس کی سرکردگی کا شرف اکبر حیدری کو حاصل تھا کانفرنس جب ذیلی کمیٹیوں میں منقسم ہوگئی تو اکبر حیدری کو بھی ہر ذیلی کمیٹی میں شریک کیا گیا اور ہندوستانی ریاستوں کے نمائندوں نے باہمی مشورہ کے لئے جو کمیٹی بنائی تھی اس کی صدارت اکبر حیدری ہی نے کی۔ مالیات سے متعلق جو ذیلی کمیٹی تھی اس میں انہوں نے خاص طور پر حصہ لیا اور والی ریاست کی ایما سے کسی ایسے وفاق میں شرکت سے انکار کیا کہ جس کی وجہ سے ریاست کی وجاہت میں فرق آتا ہو۔ ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس لندن میں منعقد ہوئی اور ۱۹۳۲ء میں تیسری۔ ان مواقع پر بھی اکبر حیدری نے حیدرآبادی نمائندوں کی رہنمائی کی۔ اور اس سلسلہ میں دراصل اکبر حیدری کو مختلف الخیال رہنماؤں سے ملنے اور ریاست اور حکومت ہند کے عام مفاد پر تبادلہ خیال کرنے کا موقع ملا۔

پریوی کونسلر | فینانس کی کارگذاریوں پر حیدر نواز جنگ کا خطاب والی ریاست کی جانب سے ملا۔ اور ملک معظم کی طرف سے "سر" کا اعزاز عطا ہوا۔ حال ہی میں پریوی کونسلر کا اعزاز بھی بخشا گیا۔

اخلاق و عادات اکبر حیدری بہت سادگی پسند انسان ہیں۔ وہ کھانے اور پہننے میں بیجا اسراف ناپسند کرتے ہیں۔ اپنی عادتوں کے وہ بہت سختی کے ساتھ

پابند ہیں۔ اس عمر میں بھی نماز و روزہ کا بڑا خیال رہتا ہے۔ اوقات مقررہ پر کام کی ادائی کو وہ اپنا فرض خیال کرتے ہیں۔ اپنے مذہب سے دلچسپی رکھتے ہیں اور دوسروں کے مذہب میں تعرض نہیں کرتے۔ اولیا کا احترام کرتے ہیں اور علماء کی عزت۔ غیر معمولی اچھے اخلاق کے انسان ہیں۔ ہر شخص سے خندہ پیشانی سے ملتے ہیں یہ اور بات ہے کہ اپنی بڑھی ہوئی مصروفیات کی وجہ سے تفصیلی ملاقات نہیں کر سکتے لیکن سنتے سب ہی کی ہیں ملنے کا کوئی وقت مقرر نہیں گھر ہو یا دفتر میں۔ تقاریب کے موقع پر یا دوسرے مقامات پر جہاں وہ نظر آئیں ملنے والوں کی ایک جماعت بھی وہاں پہنچ جاتی ہے۔

سر جے سی بوس



سر جگدیش چندر بوس

سر جے، سی، بوس

ابتدائی تعلیم جگدیش چندر بوس ۳۰ نومبر ۱۸۵۸ء کو بمقام بکرام پور پیدا ہوئے یہ گاؤں بنگال کے قدیم اور مشہور شہر ڈھاکہ کے گرد و نواح میں ہے۔ ان کے والد بھگوان چندر بوس فرید پور میں سب ڈویژنل آفیسر تھے"۔ تعلیماتی مسائل میں" ڈاکٹر بوس کہتے ہیں" میرے والد خاص قسم کے خیالات رکھتے تھے۔ مغربی طرز تعلیم ابتدائی مراحل سے گذر رہی تھی اور وہ افراد جو گورنمنٹ کے کسی نہ کسی حیثیت سے زیر اثر تھے اسکولوں کے دلدادہ ہو رہے تھے حالانکہ میرے والد بھی انگریزی حکومت کے بڑھتے ہوئے سیلاب میں بہے جا رہے تھے لیکن انہوں نے مجھے بجائے اسکول میں شریک کرانے کے گاؤں کے ایک پاٹ شالہ میں شریک کرایا یہاں میرے ہم جماعت مزدوروں کے محنتی لڑکے اور کسانوں کے فطرت پرست سپوت تھے۔ محنت و مشقت اطاعت و فرمانبرداری، مذہب کی پرستش اور دیہات سے دلبستگی میں نے ہمیں سے حاصل کی۔" اپنی ماں کے متعلق ڈاکٹر بوس بیان کرتے ہیں" میری ماں گھر پر چشمہ براہ

رہتی تھی کہ کب میں مدرسہ سے واپس آؤں اور کب وہ فرط محبت سے گلے لگائے میں عموماً اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ گھر واپس ہوتا تھا اور ان میں اکثر اس طبقہ کے لڑکے ہوتے تھے جنھیں آج کل "اچھوت" کہتے ہیں لیکن میری ماں ان کا خیر مقدم اس طرح کرتی تھی جس طرح سے کہ کسی اونچی ذات والوں کا یا خود میرا۔ ہم سب کو ایک ہی جگہ کھلاتی پلاتی اور ایک ہی طرح کا سلوک کرتی اور یوں میں نے ابتدا ہی سے ذات پات کا کوئی فرق محسوس نہیں کیا۔"

ڈاکٹر بوس پاٹ شالہ کی تعلیم کے متعلق لکھتے ہیں "اس دیہقانی مدرسہ میں مجھے بھیجنے سے مقصد یہ تھا کہ میں اپنی عمر کا ابتدائی بہترین حصہ مادری زبان سیکھنے میں صرف کروں، ملکی ماحول سے دلچسپی پیدا کروں، مذہبی درس حاصل کروں اور قومی تمدن سے متاثر ہوں۔" عجیب بات یہ ہے کہ ڈاکٹر بوس کا نگراں اس کمسنی کے زمانہ میں کوئی تعلیم یافتہ، مہذب یا معقول آدمی نہ تھا بلکہ ان کے والد نے ڈاکوؤں کے ایک سردار کو ان کی دیکھ بھال کے لئے مقرر کیا تھا۔ واقعہ یہ ہوا کہ جس زمانہ میں بھگوان چندر بوس فرید پور کے سب ڈویژنل آفیسر تھے تو لٹیروں کی ایک ٹولی سارے گاؤں کو پریشان کر رہی تھی۔ حسن اتفاق سے ایک موقع پر انھوں نے اس ٹولی کے سرغنہ کو تنہا اپنی جان پر کھیل کر گرفتار کر لیا اس جانبازی کا اس سردار پر اتنا اثر ہوا کہ جب وہ کئی برس بعد قید سے چھوٹا تو سیدھا ان کے گھر آیا اور التجا کی کہ اسے اپنے ہاں ملازم رکھ لیں۔ یہ خیال کر کے کہ اس کو دوسری جگہ ملازمت نہ ملیگی انھوں نے اسے اپنے ہاں رکھ لیا اور اپنے چار سالہ لڑکے کی خدمت پر مامور کر دیا۔ اس کا کام یہ تھا کہ ڈاکٹر بوس کو اپنی پیٹھ پر گاؤں کے مدرسہ

لیجائے اور دن بھر ان کے ساتھ رہکر شام کو گھر واپس لائے۔" وہ میری خدمت اس طرح کیا کرتا تھا کہ کیا کوئی نرس کرے گی" ڈاکٹر بوس بیان کرتے ہیں" اپنی پچھلی زندگی سے توبہ کرنے کے بعد وہ بیحد نیک ہوگیا تھا۔ کیا مجال کہ کوئی میری طرف ترچھی نظروں سے تو دیکھ لے! فرصت کے لمحات میں جس طرح کھلائی یا دادا پریوں اور دیووں کے قصّے بیان کرتی ہے بالکل اسی طرح وہ اپنے خون آشام کارنامے بیان کرتا تھا کہ کس طرح اُس نے بڑے بڑے معرکے سر کئے ہیں اور کہاں زخم کھائے ہیں" ظاہر ہے کہ ان واقعات نے ڈاکٹر بوس کی رگوں میں گرم خون دوڑا دیا اور اس زمانہ میں جبکہ حقیقی معنوں میں انسان سیکھنے اور حاصل کرنے کے قابل ہوتا ہے دلیری اور شجاعت کے درس انہوں نے حاصل کئے۔

انگلستان میں

پاٹ شالہ کی تعلیم ختم کر کے ڈاکٹر بوس انگریزی مدرسہ میں چلے گئے اور درجہ بدرجہ انہوں نے وہ تمام منازل طے کئے جن کے بعد بی اے کی ڈگری ملتی ہے۔ جب انہوں نے سینٹ زیویر کالج کلکتہ سے ڈگری لی تو اُن کے دل میں خواہش ہوئی کہ انگلستان جاکر سول سروس کے مقابلہ میں شریک ہوں انہوں نے والد سے مشورہ کیا لیکن ناکامی ہوئی۔ دراصل اُن کے والد اپنے لڑکے کی طبیعت سے اتنے زیادہ واقف تھے کہ خود ڈاکٹر بوس کو بھی پتہ نہ تھا۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ نظم ونسق کا میدان ان کے لئے موزون نہیں ہے بلکہ سائنس یا ڈاکٹری کے امتحانات اور تحقیقات ان کی طبیعت کی افتاد اور فطری رجحان کے لحاظ سے شہرت اور نیک نامی کا باعث ہوسکتے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر بوس اسی مشورہ پر عمل کرنے کے لئے انگلستان پہنچے۔

لندن پہنچکر ڈاکٹر بوس مڈیکل کالج میں شریک ہو گئے۔ چونکہ کلکتہ میں انہوں نے حیاتیات کے درس نہیں حاصل کئے تھے اس لئے پورے ایک سال تک یہاں انہیں اس مضمون کی طرف توجہ کرنی پڑی۔ دوسرے سال سے ڈاکٹری کی تعلیم برابر ہونے لگی لیکن سوء اتفاق سے ان کی صحت اس دوران میں کچھ ایسی خراب ہوئی کہ باوجود مدتوں علاج کے فائدہ نہ ہوا اور مجبوراً ڈاکٹروں کے مشورہ پر انہیں ڈاکٹری تعلیم سے کنارہ کش ہونا پڑا یہاں سے وہ سیدھا کیمبرج پہنچے ۱۸۸۴ء میں انہوں نے بی اے کیا پھر بی ایس سی میں شریک ہوئے اور نیچرل سائنس اسکالر شپ حاصل کیا۔

ہندوستان کو واپسی پروفیسر فاسٹ مشہور ماہر معاشیات نے لارڈ رپن سے جو اس وقت ہندوستان کے وائسرئے تھے ان کا تعارف کرایا اور اسی بناء پر انھیں پریسیڈنسی کالج کلکتہ میں سائنس کی پروفیسری ملگئی۔ لیکن یہ سلسلہ منصرمانہ تھا اس زمانہ میں اس کالج میں کوئی اچھا ساعمل نہ تھا اور انہیں اپنے خانگی معمل میں تحقیقاتی کام کرنا پڑتا تھا۔ انہوں نے اطمینان سے کام کیا اور تقریباً دس سال بعد ایک چھوٹا سا عمل کالج میں تیار ہوا۔ اور اسی کو ان کی منظر آنکھوں نے غنیمت جانا۔

۱۸۹۵ء سے انہوں نے سائنس پر مقالات لکھنے شروع کئے۔ پہلا مقالہ "قلم کے ذریعہ برقی شعاعوں کی تقطیب" تھا جو مئی ۱۸۹۵ء میں جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں شائع ہوا۔ اور اسی سال دو مضامین برقیات سے متعلق "الکٹریشین" میں شائع ہو کر مقبول ہوئے۔ اس کے بعد ان کا

مشہور مقالہ " برقی انعطاف نماؤں کا تعین " رائل سوسائٹی جرنل میں شائع ہوا۔
اس زمانہ میں رائل سوسائٹی کی اتنی وقعت تھی کہ اس جرنل میں کسی مضمون کا شائع ہونا بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ لوگوں نے اب بوس کی عظمت کرنی شروع کی۔ رائل سوسائٹی نے نہ صرف بوس کے مقالہ کو شائع کیا بلکہ ان سے درخواست کی کہ وہ اپنی تحقیقات کو جاری رکھیں اور ان کی معقول امداد کا وعدہ کیا۔

۱۸۹۶ء میں ڈاکٹر بوس نے دنیائے سائنس کو حیرت میں ڈال دیا۔
ان کی خدمات کے اعتراف کے سلسلہ میں لندن یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف سائنس کی ڈگری دی۔ اس زمانہ میں لاسلکی تحقیقات اور تجربات پر دنیا کے تین بہترین دماغ بیک وقت مصروف تھے۔ ڈاکٹر بوس۔ مارکونی اور امریکہ کا ایک مشہور سائنس دان۔ ڈاکٹر بوس ہندوستان میں بے سروسامانی کے عالم میں تحقیقات و تجربات کر رہے تھے اور ان کے دوسرے مدمقابل بہترین معملوں میں سرگرم کار تھے۔ مگر ڈاکٹر بوس نے سب سے پہلے کلکتہ کے ٹاون ہال میں گورنر کی موجودگی میں چھوٹے پیمانہ پر اپنے تجربات کا کامیاب مظاہرہ کیا۔

رائل انسٹی ٹیوشن میں تقریریں بوس کی شہرت آگ کی طرح پھیل گئی اور رائل انسٹی ٹیوٹ نے مدعو کیا کہ وہ انہیں مخاطب کریں۔ برقی موجوں پر انہوں نے متعدد تقریریں کیں اور نباتات اور حیوان کے محرکات کے جواب میں تجربات کرتے رہے۔ ایک دن شہرۂ آفاق تجربہ کار ماہر فعلیات سر مائیکل فاسٹر نے ان سے کہا :-

" اس لہر میں کیا نئی بات ہے ؟ نصف صدی سے ہم اس سے

واقف ہیں۔"

"آپ کے خیال میں یہ کیا چیز ہے" بوس نے دریافت کیا۔

"عضلاتی جواب کی ایک لہر"۔

"معاف کیجئے یہ دھاتی ٹین کا جواب ہے"۔

"کیا!" تعجب سے اچھل کر فاسٹر نے پوچھا" ٹین کیا تم نے ٹین کہا؟"

تفصیلات معلوم کر کے فاسٹر کو بڑی حیرت ہوئی۔

جوں جوں بوس اپنی تحقیقات بیان کرتے جاتے تھے سائنس دان مبہوت ہو کر ان کا منہ تکتے تھے۔ سر جان برڈن سانڈرسن جو اس زمانہ کے برقی فعلیات کے مانے ہوئے یگانہ روزگار استاد تھے اور انہیں حیوانات اور نباتات دونوں پر عبور کامل تھا ڈاکٹر بوس کی تقریروں کا شہرہ سنکر آکسفورڈ سے چلے آئے اور ظاہر ہے کہ سامعین میں سب کی نگاہیں ان کی طرف رہتی تھی کہ اگر وہ تعریف کریں تو بوس کی علمی لیاقت مسلمہ ہوگی۔ مگر یہاں ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ خرانٹ سانڈرسن نے کہا کہ بوس ایک ماہر طبعیات ہیں اور انہوں نے خواہ مخواہ حیاتیات کے میدان میں قدم رکھا ہے۔ اب بھی کچھ زیادہ وقت نہیں گیا اور وہ اگر چاہیں تو اپنے مقالہ کا عنوان بجائے "برقی جواب" کے "بعض طبعیاتی تعامل" رکھ سکتے ہیں۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ سب کے سب ہم آواز ہو گئے اور بوس کو ممکنہ طریقہ پر بددل کرنے لگے۔ لیکن بوس غیر معمولی عزم و استقلال کے انسان ہیں وہ جانتے تھے کہ یہ سب کچھ کسی خاص غرض و غایت کے

مدِ نظر کیا گیا ہے اور کسی مصلحت کے پیشِ نظر عمداً ردو گردانی اور تجاہلِ عارفانہ کیا گیا ہے۔ کمر ہمت باندھ کر انہوں نے رائل سوسائٹی کو آگاہ کیا کہ وہ اس مقالہ کا ایک لفظ بھی بدلنے کے لئے تیار نہیں ہیں خواہ ان کا مقالہ ناپسند ہی کیوں نہ کیا جائے ہندوستان واپس ہو کر انہوں نے غور مکرر کیا اور ایک قطعی نتیجہ پر پہنچکر دوبارہ لندن پہنچے اور رائل انسٹی ٹیوٹ میں از سر نو تجربات میں منہمک ہو گئے۔ اس اثناء میں آکسفورڈ کے مشہور پروفیسر وائینس نے ان سے خواہش کی کہ وہ اپنے تجربات انھیں دکھائیں۔ بوس راضی ہو گئے اور ایک دن وائینس ہوریس اور براؤن ہکسلے کے جانشین ہوس کی معیت میں بوس کے ہاں پہنچے اور تجربات دیکھ کر تینوں متین پروفیسر بچوں کی طرح اظہار تعجب اور خوشنودی کرنے لگے۔ ساتھ ہی انہوں نے کہا کہ رائل سوسائٹی اگر اس مقالہ کو قبول نہیں کرے تو ہم بخوشی کیمن سوسائٹی کی جانب سے اس کو قبول کرتے ہیں کیونکہ ہم اس سال صدر اور معتمد ہیں۔ مقالہ کی از سر نو ترتیب کے لئے بوس ہندوستان واپس آگئے اس اثناء میں انہیں معلوم ہوا کہ کسی اور پروفیسر نے ان کی تحقیقات کو اپنا لیا ہے اور اس کو فی زمانہ اہمیت دی جا رہی ہے۔ بوس نے اپیل کی اور اپنا سارا کام کمیشن کے آگے رکھ دیا۔ بڑی تحقیق کے بعد آخر تصفیہ بوس کے حق میں ہوا

پیرس میں تقریریں ۱۹۰۰ء میں سر جان وڈبرن گورنر بنگال نے انہیں پیرس کانگرس آف سائنس میں نمائندگی کرنے کے لئے بھیجا۔

اس سلسلہ میں وہ پیرس میں اس قدر ہر دل عزیز ہوئے کہ انہیں مختلف سوسائٹیوں نے تقریروں کے لئے مجبور کیا۔ ۱۹۰۲ء میں انہیں ایک مشہور سوسائٹی کی کونسل کا

رکن بھی بنا لیا گیا۔

دنیا کا سفر آکسفورڈ یونیورسٹی نے تقریروں کا انتظام کیا اور بوس وہاں پہنچے۔ آکسفورڈ کے بعد کیمبرج کا نمبر تھا۔ یہاں انہوں نے نباتیاتی تحقیقات کا ذکر کیا اور بعض پودوں کا ذکر ایسا کیا کہ وہاں کے بعض نامی گرامی پروفیسروں کو ان پودوں کا شوق اس حد تک بڑھا کہ انہوں نے ہندوستان سے مٹی منگوائی اور خاص طور پر ان پودوں کی نشو و نما کا انتظام کیا۔ پروفیسر سیوارڈ۔ سر فرانسس ڈارون۔ اسٹارلنگ۔ آلیورا اور کیارتھ ریڈاان سے اس سلسلہ میں خاص طور پر متاثر ہوئے۔ مسٹر بالفوران کے معمل میں آئے اور حیاتیاتی تجربات کا معائنہ کر کے حیرت و خوشی کا اظہار کیا۔ وُئنیا میں ڈاکٹر بوس نے اپنی ایک خاص تقریر کا انتظام کیا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے بعض تجربات کے عکس بھی دکھائے۔ امپریل یونیورسٹی وُئنیا کے پروفیسر مولشن نے ڈاکٹر بوس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ یورپ کو ہندوستان کا ممنون ہونا چاہیئے کہ اس نے ایک ایسا پوت پیدا کیا جو نباتیاتی دنیا میں اپنے عجیب و غریب انکشافات کی بدولت ناقابل فراموش ہے۔ بعض محققین نے تو بوس سے یہاں تک خواہش کی کہ وہ کلکتہ کے معمل میں ان کے زیر نگرانی کام کرنا چاہتے ہیں۔

اس سفر میں ڈاکٹر بوس امریکہ بھی گئے "مین" سے "کیا لیفورنیا" تک تمام یونیورسٹیوں نے دعوت ناموں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ مشہور علمی ادارے مثلاً نیویارک اکیڈمی آف سائنس۔ دی بروک لین انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ

سائنس۔ ہارورڈ۔کولمبیا اور شکاگو یونیورسٹی نے حد درجہ شوق کے ساتھ ان کے خطبات سُنے۔

شاہکار دنیا کے سفر سے واپس ہو کر بوس اپنی تحقیقات میں پہلے سے زیادہ منہمک ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا شاہکار یہ انکشاف ہے کہ نباتات اور حیوانات کی اعصابی زندگی میں کوئی فرق نہیں ہے اور ایک حد تک یہ دکھائی دیتا ہے کہ "موسا" کا پودا بالکل انسانی اقوام کی زندگی کی تاریخ کو دہراتا ہے"۔

خود بوس نے نباتیاتی اور حیواناتی زندگیوں کا فرق ایک جگہ اس طرح بیان کیا ہے:۔

"حیوانات صدمہ کا اظہار حرکات سے کرتے ہیں برخلاف اس کے اکثر پودے متواتر صدمات کی بھی مدافعانہ قوت رکھتے ہیں۔ حیوانوں کی بعض بافتیں مسلسل متحرک رہتی ہیں بغیر کسی ظاہری سبب کے بھی اور یہ تسلسل مختلف صورتوں میں مختلف اثرات پیدا کرتا ہے نباتات میں اس قسم کی کوئی چیز نہیں پائی گئی۔ حیوانوں کی بافتیں برقی ارتعاش پیدا کرتی ہیں برخلاف اس کے معمولی نباتات میں اس قسم کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی"۔

اس نئی تحقیق کی کامیابی کا باعث ایک نئے آلہ کی ایجاد ہوئی وہ اس قسم کا بنایا گیا ہے کہ پودے اپنی تحرکات کا احساس اور خصوصی تحریکات کی پیمائی کر سکتے ہیں۔ اس آلہ کا نام بوس نے "گونج پیما" رکھا۔ اس کی اور صداقت کا یہ حال ہے کہ دل کی ایک حرکت کا ایک سکنڈ کے ہزارویں حصے تک کا وقفہ بھی بتا سکتا ہے

اور پھر کمال یہ کہ یہ آلہ بوس نے اپنی نگرانی میں ہندوستان ہی میں بنوایا۔ اس ہندوستانی آلہ کو ساری دنیا نے تجربہ کے بعد قابل اعتبار پایا اور دنیا بھر سے اس کی مانگ ہونے لگی۔

ڈاکٹر بوس نے تجربہ کیا کہ اگر ایک پودے پر ضرب لگائی جائے تو چوٹ لگنے اور اس کے تاثرات ظاہر ہونے میں ایک سکنڈ کا $\frac{1}{5}$ وقفہ ہوتا ہے۔ نشہ آور اشیا کا اثر نباتات پر اسی طرح ہوتا ہے جس طرح سے کہ حیوانات پر۔ زہر کا بھی دونوں پر یکساں اثر ہوتا ہے۔ درخت رات کے بارہ سے صبح کے آٹھ بجے تک سوتے ہیں بالکل اسی طرح جس طرح ترقی یافتہ دنیا کا متمدن انسان ہوتا ہے۔ موت کے اثرات پودوں پر جس طرح رونما ہوتے ہیں ان کا بوس نے بڑی کامیابی سے تجربہ کیا۔

تصنیفات ۱۹۰۶ء میں "پودوں کا جواب" شائع کی اور ۱۹۰۷ء میں "برقی فعلیات"۔ مشہور سائنٹیفک رسالہ "نیچر" نے ان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا "ماہران حیاتیات ان کتابوں کو پڑھ کر دنگ رہ جائیں گے کہ کسطرح ان کے مصنف نے اپنے مشاہدہ۔ تجربہ اور تحقیق سے ایک انقلابی لہر دوڑادی۔ مصنف نے علمی مباحث کو اپنی پختہ کارانہ طرز میں اس قدر دلچسپ بنایا ہے کہ ہم اس کے مطالعہ کی پُر زور سفارش کئے بغیر نہیں رہ سکتے"۔

گورنمنٹ کا اعتراف ۱۹۱۳ء میں بوس پچپن سالہ ہونے کی وجہ سے پریسیڈنسی کالج کی پروفیسری سے علیحدہ ہونے والے تھے لیکن چونکہ کالج کو ان کی خدمات کی بے انتہا ضرورت تھی اس لئے مزید دو سال کی

توسیع کیگئی۔ اس کے بعد ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے پوری تنخواہ بطور وظیفہ دی گئی اور ساتھ ہی یہ استدعا کیگئی کہ تحقیقات کرنے والے طلباء کو وہ ہدایات دیتے رہیں اور ایک حد تک ان کے کام پر نظر رکھیں۔ بوس کے لئے یہ فرائض بار گراں نہ تھے بلکہ وہ تو ان کی مرضی کے عین مطابق اور خواہش کے بالکل موافق تھے۔ اسی زمانہ میں بوس کو ان کی علمی تحقیقات اور کارگزاری کے صلہ میں "سر" اور سی۔ یس۔ آئی کے امتیازی خطابات دئے گئے۔

بوس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ابتدا ہی سے بوس یونیورسٹیوں میں تحقیقاتی اداروں کے محرک تھے اور وہ اس قسم کے اداروں کی نشو و نما اور ترقی کو یونیورسٹی کی کامیابی کا معیار خیال کرتے تھے۔ ۱۹۱۳ء میں "بنگال ایجوکیشنل ریویو" میں اسی سے متعلق تفصیل کے ساتھ لکھتے ہوئے وہ یونیورسٹیوں سے استفسارات کرتے ہیں "تمہاری وجہ سے علم کس طرح پھیلا؟ کیا کیا انکشافات و تحقیقات تمہاری مدد سے ہوئے؟ محققین کو تم نے کتنی مدد دی اور کتنے طلباء کو تم نے صحیح معنوں میں محقق بنایا"؟ مختصر یہ کہ بوس کے نزدیک تحقیقات کا شعبہ یونیورسٹی میں نہ صرف اہم ہے بلکہ ضروری بھی اور بڑی حد تک اس کی وقعت اور نیک نامی کا معیار بھی۔ ہندوستانی ماحول کی ناموافقت بوس کو پست ہمت نہیں کرتی بلکہ ان کے آگے ہمیشہ ہندوستان کا وہ عہد زرین رہتا ہے جبکہ نلندا اور ٹیکسیلا کی جامعات مشرق کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے خیال میں ہندوستان کی آب و ہوا بڑی حد تک خاص قسم کے پودوں کی نشو و نما میں مد ہوتی ہے جس کی وجہ سے نباتیاتی

تحقیق کے یہاں خاص مواقع حاصل ہیں ۔

۳۰ر نومبر ۱۹۱۷ء کو بوس نے اپنی ۵۹ ویں سالگرہ کے موقع پر اس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا افتتاح کیا۔ اس وقت جو تقریر بوس نے اس ادارہ کو قوم کے نام سے منسوب کرتے ہوئے کی وہ ان کی خطابت کا عظیم الشان کارنامہ ہے انہوں نے کہا :-

"میرا ادارہ بلا امتیاز مذہب وملت، فرقہ وجماعت سن وسال یا جنس وحیثیت سب کے لئے یکسان کھلا رہیگا بشرطیکہ وہ نام ونمود طاق نسیاں پر رکھکر آئیں۔ علم کا مشعل ہاتھ میں ہو دل میں خلوص کوٹ کوٹ کر بھرا ہو دماغ میں خود غرضی اور دنیاوی طمع نہ ہو، ارادے مضبوط ہوں اور حوصلے بلند، دُھن کے پورے ہوں اور کام کے پکے ...... میرے انسٹی ٹیوٹ میں ابجد خوانی نہ ہوگی اور نہ پڑھے ہوئے سبق دھرائے جائیں گے بلکہ جدید انکشافات اور نئی تحقیقات ہوں گی جن کو دنیا کی آنکھوں نے نہ دیکھا ہو اور جن کو دنیا کے کانوں نے نہ سنا ہو۔ اس قسم کے تحقیقاتی کارناموں کی نشر واشاعت کا اس قدر معقول انتظام کیا جائے گا کہ سارا عالم ہماری کارگذاریوں سے واقف ہوتا رہے ...... اسطرح ہمارا مقصد کہ ماضی کی ان درخشاں روایتوں کو

جنھیں وقت کی دراز دستیوں نے پردہ خفا میں رکھا ہے
وہ بار منصۂ شہود پر لایا جائے پورا ہو کر رہیگا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

بعد کی تحقیقات رفتہ رفتہ یہ انسٹی ٹیوٹ اتنا بڑھتا گیا کہ عوام کے علاوہ خواص بھی اس کو وقعت کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

چنانچہ لارڈ چلمسفورڈ جو اس زمانہ میں وائسرائے تھے، بوس کا تحقیقاتی کام دیکھنے کے شوق میں یہاں آئے اور متواتر دو گھنٹے تک اس کا تفصیلی معائنہ کر کے بے انتہا مسرور ہوئے۔ اسی زمانہ میں بوس نے ایک ایسا محیر العقول تجربہ کیا جو اس وقت قریب قریب ناممکن سمجھا جارہا تھا۔ یہ درختوں کا بہترین حالت میں "کلچا فو" ہے۔ تجربہ کے طور پر کلکتہ میں انہوں نے بعض درختوں کو ایک جگہ سے ان پر سکتہ کا عالم طاری کر کے اکھیڑا اور دوبارہ انھیں کسی اور مقام پر لگایا جہاں وہ برابر عمدہ حالت میں پھلتے پھولتے رہے۔

دوسری کامیابی High Magnification Creseograph

یہ عجیب و غریب ایجاد ہے۔ اس کی مدد سے پودے کی قلیل ترین مدت۔ یعنی ایک سکنڈ کی نشو و نما کی بھی تلبیر اور پیمائش کی جاسکتی ہے۔ خورد بین اس کے آگے بحیثیت ہو کر رہ جاتی ہے اور اس کے مقابلہ میں $\frac{1}{10}$ گنا بھی سہولت مہیا نہیں کر سکتی یہ ایجاد ایک نہ ایک دن زراعتی دنیا میں ایک انقلاب عظیم برپا کرے گی۔

مصر میں بوس کی تحقیقات کی شہرت سائنس کی دنیا میں آگ کی طرح پھیل گئی نہ صرف یورپ اور امریکہ میں ان کا نام بلا تکلف لیا جانے لگا بلکہ

مصر میں بھی لوگ ان سے استفادہ کرنے کے متمنی ہوئے۔ سائنس کے طلبار اور پروفیسروں کی خواہش پر حکومت کو کان کھڑے کرنے پڑے۔ علاوہ اس کے مصر کا محکمۂ زراعت چاہتا تھا کہ ان کے نباتیاتی نظریوں سے پورا پورا فائدہ اٹھائے اس لئے سرکاری طور پر زراعت کے وزیر نے ان کی دعوت کا سامان کیا اور حکومت مصر نے حکومت برطانیہ سے درخواست کی کہ وہ بوس کو مصر آنے کے لئے آمادہ کریں۔ بوس نے جب رضامندی کا اعلان کیا تو ان کے خیر مقدم کی تدابیر عمل میں آنے لگیں مصر میں کیا عوام اور کیا خواص سب چشم براہ تھے اور انہوں نے ان کے شایان شان استقبال کیا۔ خود شاہ مصر نے ان کی تقریریں نہایت دلچسپی کے ساتھ سنیں۔ قاہرہ میں بھی خاص طور پر انکی تقریروں کا انتظام کیا گیا خصوصاً "رائل اگریکلچرل سوسائٹی" میں انہوں نے جو تقریر کی وہ خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس سلسلہ میں مصر کے جرائد و رسائل نے ان کا تعارف ملک کے طول و عرض میں کرایا۔

چین میں بوس کی خدمات کا اعتراف

ستّرویں سالگرہ کے موقع پر چین کے وزیر تعلیمات نے حسب ذیل تار مبارک باد کا روانہ کیا:—

"ہم دست بدعا ہیں کہ خدا آپ کو کئی سال تک زندگی کی ماہیت اور اصلیت کے انکشاف کے لئے دنیا میں باقی رکھے۔ باور کیجئے سارا ایشیا آپ کی ذات پر فخر کرتا ہے۔"

اس کے جواب میں بوس نے لکھا:—

میری چالیس سالہ خدمات کی وجہ سے ہندوستان نے دنیائے سائنس میں جو درجہ حاصل کر لیا ہے اس سے مجھے ایک گونہ طمانیت حاصل ہوئی ہے۔ مغرب آج کل جنگ وجدال۔ خونخواری اور خون ریزی کو ترقی سمجھ رہا ہے۔ حالانکہ ان کا طریقۂ کار تمدن و تہذیب کی بیخ کنی کر رہا ہے۔ میرے خیال میں اس سے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ بین الاقوامی اتحاد اور علمی وفاق قائم کیا جائے۔ یہی انسانیت کو فنا کے ہاتھوں سے محفوظ رکھے گا اور یہی میری آرزو ہے کہ مشرقی پیغام ہو"۔

بوس اپنے معاصرین کی نظروں میں

برنارڈ شا نے بوس کی تحقیقات کو بڑی دلچسپی سے دیکھا اور باوجود اس مضمون سے کوئی اُنس نہ رکھنے کے بھی بوس کے کارناموں کو بہت سراہا۔ اس نے اپنی تصنیفات کا ایک خاص مجموعہ ان کی نذر کیا یہ لکھکر:۔

"سب سے چھوٹے ماہر حیاتیات کی طرف سے سب سے بڑے ماہر حیاتیات کی خدمت میں"۔ رومن رولینڈ نے اپنی تصنیف خاص طور پر پیش کی اور بطور خلوص یہ الفاظ لکھے:۔

"ایک نئی دنیا کو روشناس کرانے والے کی خدمت میں"!

"اسکپٹیٹر" کے اڈیٹر نے ایک پُرتکلف دعوت ان کے اعزاز میں ترتیب دی

جس میں اُس نے خاص طور پر اس زمانہ کے مشہور ادیبوں کو تبادلہ خیال کیلئے مدعو کیا جن میں قابل ذکر گالز ورذی۔ نوایس۔ ربیکا ویسٹ۔ نارمن اینجل۔ آئیس۔ براؤن وغیرہ ہیں۔ ان سبھوں نے بوس سے خواہش کی کہ وہ اپنے تجربات بیان کریں۔ جب بوس نے ان کا مختصراً تذکرہ کیا تو انہوں نے ہندوستان سے متعلق سوالات کیے بوس نے ان سب کا جواب نہایت عمدگی سے دیا اور ہندوستانی حالات کا بڑی خوبی سے انھیں اندازہ کرایا۔

قوم کی رہنمائی

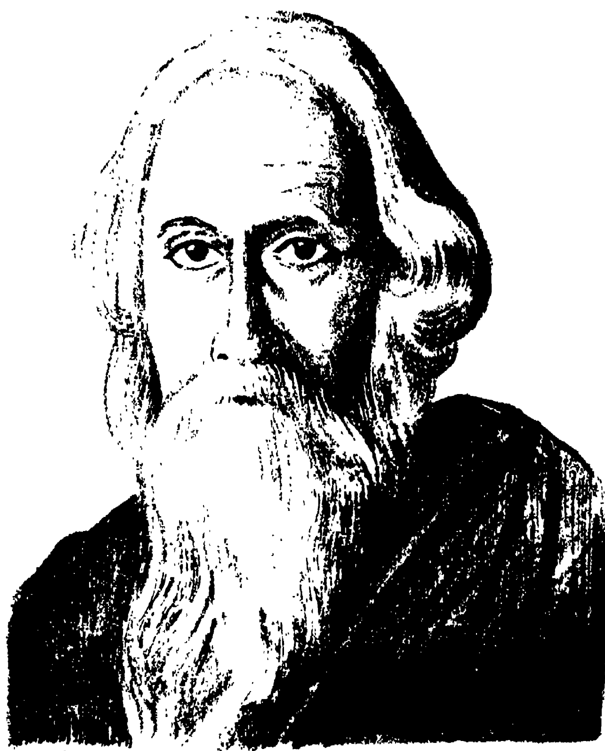
مدورا میں انہوں نے کہا:۔

"میں نے دنیا کا چکر کئی دفعہ کاٹا ہے اور اکثر مجھے موقع ملا ہے کہ دوسری اقوام کے خصوصیات معلوم کروں۔ اس سلسلہ میں مجھے ان میں دو چیزیں نمایاں نظر آئیں ایک یہ کہ وہ چاہتی ہیں کہ زندہ رہیں۔ انھیں مستقبل کی بڑی فکر ہے اور اسی کو سنوارنے کی وہ ہمیشہ کوشش کرتی ہیں۔ اور اسی تگ و دو میں وہ نیچر سے مدد لیتی ہیں اور اس ہی کے سہارے وہ شاہراہ ترقی پر قدم اٹھاتی ہیں مگر دنیا میں بعض افراد ایسے بھی ملیں گے جو محض اپنے ماضی کی یاد میں گم سم ہیں اور "پدرم سلطان بود" کہکر پھولے نہیں سماتے۔ اب سوال یہ ہے کہ ہمیں کون سا طریق عمل اختیار کرنا چاہیئے۔ آیا ماضی کے خوش گوار خواب خرگوش میں ہمیں اپنے آپ کو بھلا دینا چاہیے"

یا میدانِ عمل میں آکر اُن اقوام کے دوش بدوش کھڑا ہونا چاہیئے جو کہ نیچر سے استفادہ کر کے اپنے مستقبل کو سنوارنے کی فکر میں سرگرداں ہیں۔ ہمارا ماضی یقیناً خوشگوار ہے۔ اور یہ رُعب دار اونچے اونچے محلات، یہ پرفضا باغات اور یہ رفیع المرتبت منادر و مساجد جو میرے اطراف واکناف میں بکھرے پڑے ہیں مجھے ہر آن باور کراتے ہیں کہ ہمارے آبا واجداد وحشی، غلام اور مفلس ہرگز نہ تھے ـــــ مگر ہمارا مستقبل ؟ ـــــ

میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہمارا فرض ہے کہ اپنے حال و مستقبل کو اس قابل بنائیں کہ وہ ہمارے ماضی کی دیرینہ روایات کو قائم و برقرار رکھ سکیں ۔"

رابندرناتھ ٹیگور



سر رابندر ناتھ ٹیگور

رابندر ناتھ ٹیگور

آبا و اجداد رابندر ناتھ ٹیگور کے دادا دوار کا ناتھ بنگال کے ان چند زمینداروں میں سے تھے جو کافی دولت مند ہونے کے باوجود مصلح قوم و ملک سمجھے جاتے تھے۔ مذہب چونکہ ان دنوں جزو زندگی تھا اور ان کی طبیعت اصلاح کی طرف مائل تھی اس لئے انہوں نے اس شعبہ میں بھی اپنی طبیعت کی جولانی دکھانے کے لئے میدان ڈھونڈھ نکالا اور راجہ رام موہن رائے کے ساتھ برہمو سماج کی نشر و اشاعت میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ قلیل عرصہ میں انہوں نے جو مدد راجہ رام موہن رائے کو دی وہ ایسی نہ تھی کہ فراموش کر دی جاتی۔ اس سلسلہ میں ان کی شہرت بڑھتی گئی اور عوام و خواص انھیں رام موہن رائے کا دست راست کہنے لگے۔

ٹیگور کے والد دوندرا ناتھ ٹیگور ایک ذی علم شخص تھے۔ انھیں فنون لطیفہ سے بڑی دلچسپی تھی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ادب و فلسفہ کا بھی

ذوق فطرت نے انھیں عطا کیا تھا۔ اسی سلسلہ میں انہوں نے اسلامی ادبیات کا مطالعہ کیا۔ مولانا روم کی مثنوی اور حافظ کا دیوان پڑھ کر انھیں تصوف و معرفت کا چسکا لگا اور وہ اپنا پورا وقت جو برہمو سماج کی پرچار سے بچ رہتا اسی کی نذر کر دیتے تھے۔

پیدائش رابندر ناتھ ٹیگور ۶ مئی ۱۸۶۱ء کو کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ اسی دن اسی تاریخ اور اسی سال پنڈت موتی لال نہرو آنجہانی بھی پیدا ہوئے تھے۔ یہ ساعت اتنی مبارک تھی کہ ایک سیاسی میدان میں اپنی جولانیاں دکھا کر غیر معمولی اثرات پیدا کر لیا اور دوسرا اپنی شاعری کے میٹھے سروں سے ساری دنیا کا دل موہ لیا۔

مناظر قدرت سے دلچسپی ابتدا ہی سے ٹیگور بہت اداس رہتے تھے اور گھر کی کسی چیز سے انھیں دلبستگی نہ ہوتی تھی لیکن بہت جلد انہوں نے اپنا دل بہلانے کا ذریعہ ڈھونڈھ نکالا اور یہ مناظر قدرت تھے ہر روز وہ کھلے دریچہ کے آگے بیٹھتے اور تاحد نظر دور دور کے مناظر قدرت کی سیر کرتے تھے لیکن ایک دن جب انہوں نے نیلے نیلے آسمان پر رنگ برنگ کے بادل دوڑتے دیکھے تو ان کا دل بلیوں اچھلنے لگا اور انہوں نے وہی کیفیت محسوس کی جو ورڈز ورتھ قوس قزح کو دیکھکر محسوس کرتا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:-

"...... میں خوشی کے مارے پھولے نہ سماتا تھا جب
آسمان پر میری آنکھوں کے آگے بادل ایک دوسرے کو
پکڑنے کی کوشش میں دوڑتے نظر آتے اور میں اس

نظارہ میں اتنا محو ہو جاتا کہ یہ محسوس کرنے لگتا کہ میں بھی
انھیں میں کا ایک بادل ہوں"

مناظر قدرت سے ٹیگور اس وقت سے متاثر ہیں جبکہ انھیں عقل سے زیادہ آنکھوں پر بھروسہ تھا۔ آسمان کی رنگارنگی سے وہ نظریں ہٹاتے تو آس پاس کے سبزہ زاروں پر نظریں جماتے نہ سبزہ اُن کے لئے بیگانہ تھا اور نہ بڑے بڑے درختوں کے مہیب سایہ سے وہ ڈرتے تھے۔

وہ اپنے بچپن آشنا، درختوں سے مخاطب ہوکر پوچھتے ہیں:۔

"اپنی لمبی لمبی اور گنجان پار بنیوں کے ساتھ
اُو بڑ کے درختو
تم ایک جوگی معلوم ہوتے ہو جو آسن جمائے چپ سادہ رہا ہو
کیا تمھیں وہ بچہ بھی یاد ہے جس کا تخیل تمہارے گھنے سایہ سے کھیلتا تھا؟"

ابتدائی تعلیم

ایک دن انھوں نے دیکھا کہ بڑے بھائی اور بڑی بہن کا لڑکا مدرسے جارہے ہیں تو خیال ہوا کہ "کاش میں بھی مدرسہ جاسکتا" کوشش تو بہتری کی لیکن یہ کہکر کہ "تم ابھی اس قابل نہیں ہوئے، انھیں ساتھ نہ لیا گیا۔ یہ پہلی پیاس دل میں کھٹک رہی تھی کہ اتفاقاً کچھ ہی دنوں بعد زمانہ نے ان کا ساتھ دیا اور رو دھو کے مدرسہ آنے جانے لگے لیکن کہنے والوں نے کہا "اب تو تم مدرسہ جانے کے لئے ضد کر رہے ہو اور کچھ دنوں بعد وہ وقت بھی آئے گا جب مدرسہ نہ جانے کے لئے ضد کروگے"

مدرسہ میں انھوں نے وہی پڑھا اور اسی طرح پڑھا جس طرح کہ اور لڑکے بھی

پڑھتے تھے لیکن گھر پر ان کی کتابوں کا ذخیرہ ملازمین کی سستی قصے کہانیوں کی کتابوں تک تھا اور ان کا مکتب بسا اوقات مکان کا وہ گوشہ ہوتا تھا جہاں کہ سارے گھر کے نوکر کام کاج سے فارغ ہو کر قصہ خوانی میں مصروف ہوتے تھے۔ یہ قصے عموماً مذہبی ہوتے تھے اور رامائن اور مہابھارت کی طویل لیکن دلچسپ نظمیں خاص لَے اور ترنم کے ساتھ پڑھی جاتی تھی۔

ٹیگور ان قصوں کو بڑی دلچسپی سے سنتے تھے اور بڑی حد تک متاثر بھی ہوتے تھے حتیٰ کہ ایک دن جب ایک ملازم لڑکے نے جو ان کے ساتھ کھیلنے پر مامور تھا۔ ان کے گرد ایک حلقہ بنا کر یہ کہا کہ "آپ اس سے باہر نہ ہوں" تو انھیں سیتا اور لکشمن کا واقعہ یاد آ گیا کہ کس طرح لکشمن نے سیتا کے اطراف حلقہ کھینچکر یہ ہدایت کی تھی کہ وہ اس سے باہر نہ ہوں۔ اور اس کے ساتھ ہی اتنے متاثر ہوئے کہ بڑی دیر تک اس حلقے کے باہر آنے سے ڈرتے رہے مبادا کوئی حادثہ ظہور میں نہ آئے۔

ایک دن ٹیگور جب اپنے پنڈت سے گھر پر پڑھ رہے تھے تو انھیں یہ سُنکر حیرت ہوئی کہ یہ نیلا آسمان ان کے سر پر دراصل سائبان نہیں ہے۔

"ایک سیڑھی کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری، اسی طرح تم اوپر چڑھتے جاؤ لیکن تمہارا سر کبھی آسمان سے نہیں ٹکرائے گا"، پنڈت جی نے کہا۔

"ہمارے گھر میں جتنی سیڑھیاں ہیں اگر سب سلسلہ سے
جمادی جائیں اور اُن پر چڑھا جائے تو؟" ٹیگور نے پوچھا
"گھر ہی کی نہیں بلکہ سارے شہر کی سیڑھیاں یکجا کر دیجائیں

تب بھی تم آسمان کو چھو نہیں سکتے" ٹیگور نے دل میں خیال
کیا" اوہ! پنڈت جی کتنے لائق ہیں —— یہ راز
ان کے سوا کسی اور کو معلوم نہ ہوگا"

ابھی وہ "اورئینٹل سیمنری" ہی میں تھے کہ ان کے ننھے سے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہر دفعہ شاگرد کی حیثیت سے اوروں کے آگے زانوئے ادب تہہ کرنا ذلت کی بات ہے۔ کبھی پڑھنا تو کبھی پڑھانا بھی چاہیئے۔ بات تو معقول تھی لیکن سوال مکتب کا تھا مگر اس مشکل کو انہوں نے اس طرح حل کیا کہ ان کے ورانڈے کے ایک گوشہ میں جہاں بہت سی لکڑی کی سلاخیں لگی ہوئی تھی اس کو مکتب بنایا اور سلاخوں کو شاگرد۔ خود ایک کرسی پر سامنے بیٹھتے۔ بید ہاتھ میں لئے، رعب دار چہرہ بنائے ابروں پر بل ڈالے تھوڑی تھوڑی دیر میں جھنجھلا کر کسی نہ کسی سلاخ پر برس پڑتے اور بالکل اسی طرح جس طرح استاد غبی یا شریر لڑکے کو زدوکوب کرتا ہے سلاخوں کو مارتے مارتے تھک جاتے۔ غرض یہ کہ وہ اس طرح استاد کا سانگ بھرتے اور دل ہی دل میں خوش ہوتے۔ مگر چپکے چپکے ان کے دل میں یہ خیال گذرتا کہ نقل کر لینا کتنا آسان ہے اور اصل کو پہنچنا کتنا دشوار!

نارمل اسکول

"اورئینٹل سیمنری" سے نکل کر وہ نارمل اسکول میں داخل ہوئے۔ یہاں کی جو چیز سب سے پہلے ان کے ذہن میں محفوظ ہوئی وہ پڑھائی شروع ہونے سے پہلے تمام لڑکوں کا صف باندھ کر گانا تھا۔ اس کا مقصد شاید یہ تھا کہ مدرسہ کا کام لڑکے ہنسی خوشی اور جوش وخروش سے شروع کریں۔ لیکن یہ ایک دلچسپ روایت تھی اور لڑکے اس نظم سے متاثر ہونے سے زیادہ

اس کے روایتی اثرات قبول کر چکے تھے کیونکہ یہ نظم غیر زبان یعنی انگریزی میں تھی اور ظاہر ہے کہ اسکول کے چھوٹے بچے انگریزی کا مفہوم اس عمدگی سے سمجھنے سے قاصر تھے کہ متاثر ہوتے طرفہ یہ کہ موسیقی کے لیے بھی غیر ملکی تھی جس کو وہ آسانی سے قبول بھی نہ کر سکتے تھے۔

ٹیگور کو نہ اس اسکول سے دلچسپی تھی اور نہ طریقہ تعلیم سے اور اسی وجہ سے وہ بہت دل گرفتہ رہتے تھے۔ دوسرے لڑکوں کی طرح وہ بھی اگر مدرسہ کے ہنگامہ میں گم ہو جاتے تو ان کا دل یقیناً بہل جاتا لیکن وہ اپنے ساتھیوں سے الگ تھلگ دوسری منزل پر ایک کمرے میں دریچہ کے آگے بیٹھے سڑک پر آتے جانے والوں کا تماشہ دیکھا کرتے اور جب دل اس سے اکتا جاتا تو مدرسہ کی تعلیم کا زمانہ شمار کرنے لگتے۔ دن، ہفتے۔ مہینے، سال، ایک دو تین ——— "الہی توبہ یہ سلسلہ تو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا" وہ بیزار ہو کر کہتے۔

اسکول کے استادوں میں سے ایک استاد ٹیگور کے ذہن میں اب تک محفوظ ہے۔ یہ اتنا سخت کلام تھا کہ ٹیگور بالعموم اس کے سوالوں کا جواب خموشی سے دیتے کیونکہ اس وقت بھی انھیں خیال تھا کہ۔ جواب جاہلاں باشد خوشی؛ دوسرے لڑکے پڑھتے اور ان کی آواز مکھیوں کی بھنبھناہٹ معلوم ہوتی اور وہ ایک گوشہ میں چپ چاپ بیٹھے یہ سوچتے رہتے کہ ہتھیار کی مدد کے بغیر دشمن کو کس طرح زیر کیا جا سکتا ہے۔ پورا سال اسی طرح گذرا اور جب امتحان ہوا تو سب لڑکوں اور ان سے زیادہ استاد کو تعجب ہوا یہ دیکھ کر کہ وہ جماعت میں اول آئے۔ استاد نے حکام بالا سے شکایت کی کہ مزودان کے معاملہ میں

سفارش یا جانب داری سے کام لیا گیا ہے۔ اور یہ حرکت تعلیمی معاملات میں نہایت شرم ناک ہے۔ اس پر ان کا دوبارہ امتحان لیا گیا اور خاص طور پر نگرانی کی گئی لیکن اس دفعہ بھی ان کے نمبر تمام لڑکوں سے زیادہ آئے۔

شاعری کی ابتدا: ٹیگور کی عمر مشکل سے کوئی آٹھ برس کی ہوگی اور ان کی پھوپھی کا لڑکا جیوتی ان سے کافی بڑا تھا۔ وہ اکثر ٹیگور کے آگے شکسپیر کے مشہور ڈراما ہملٹ کی "خود کلامیاں" بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھتا تھا۔ ایک دن نہ معلوم جیوتی کے دل میں کیا سمائی کہ اس نے ٹیگور کو اپنے کمرے میں بلوا بھیجا اور نہ معلوم کیوں ان کو ایک نظم کہنے کے لئے کہا۔ ٹیگور کے لئے یہ خواہش عجیب غریب تھی کیونکہ اس سے پہلے کبھی ان کے دل میں نظم کہنے کا خیال پیدا ہی نہ ہوا تھا اور نہ انھیں یہ معلوم تھا کہ نظمیں کس طرح کہی جاتی ہیں۔ تھوڑی دیر وہ دم بخود کھڑے رہے اور ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں۔ نظم ہوتی کیا چیز ہے، کہی کیونکر جاتی ہے اور موضوع کیا ہوتا ہے؟ اس کی انھیں مطلق خبر نہ تھی البتہ لے دے کے بس اتنا جانتے تھے کہ ان کی درسی کتابوں میں بعض سبق ایسے ہیں جنھیں اساتذہ نظمیں کہتے ہیں اور ان ہی کی تتبع میں وہ بھی ان کو نظمیں کہا کرتے تھے اور حسب ہدایت زبانی یاد بھی کیا کرتے تھے۔ اسی خیال کے ساتھ ہی ساتھ انہوں نے اپنے ذہن میں پڑھی ہوئی نظموں کو دھرایا اور جو ترنم انھیں محسوس ہوا اسی وزن پر ایک چھوٹی سی نظم نیچے سروں میں الاپنے لگے۔

انسان کا خاصہ ہے کہ وہ پہلی دفعہ کوئی چیز پیش کرتے ہوئے بہت ہچکچاتا ہے۔ کچھ جھینپتا بھی ہے اور کچھ ڈرتا بھی ہے کہ کہیں لوگ ہنسی نہ اڑائیں

یا بیوقوف نہ بنائیں لیکن جب وہ ایک دفعہ منظرِ عام پر آجاتا ہے تو اس میں مبتدی کی سی شرم و جھجک باقی نہیں رہتی اور وہ علی الاعلان اپنے افکار کو پیش کرتا ہے یہی حالت ٹیگور کی بھی ہوئی۔ پہلی دفعہ جتنا وہ تکلف کئے ہیں دوسری دفعہ نہیں کئے اور تیسری چوتھی مرتبہ تو وہ بالکل ہی بے باک ہو گئے۔

اب تو انہوں نے ایک باضابطہ بیاض بنائی ٹیڑھی ترچھی لکیریں کھینچکر اپنا کلام آپ لکھنے لگے۔ جیوتی نے ان کی شاعری کا تعارف گھر میں سب سے کرادیا۔ وہ تعریفیں کرتا، اور یہ فوراً ہی بیاض کھولکر سنانا شروع کر دیتے۔ ایک دن "دی نیشنل پیپر" کے اڈیٹر ناگوپال متر سے جیوتی نے ان کا تعارف کرایا۔ بس پھر دیر کیا تھی۔ شاعر اپنا کلام تو اپنے ساتھ ہی رکھتا ہے انہوں نے فوراً نظم سنانی شروع کر دی۔ اس نظم کا عنوان غالباً "کنول" تھا۔ ناگوپال بابو نے ایک لفظ کے متعلق دریافت کیا حالانکہ وہی لفظ سارے گھر والوں نے بہت پسند کیا تھا۔ ٹیگور نے اس کا کوئی جواب تو نہ دیا البتہ دل ہی دل میں یہ عہد کرلیا کہ آئندہ کبھی ان کو نظم نہ سنائیں گے کیونکہ نظم کو پسند کرنے کی بجائے وہ چناں و چنیں کرتے ہیں۔

اسکول کا مہتمم بڑا سخت گیر انسان تھا۔ اس کا اجلاس دوسری منزل پر تھا اور لڑکے اس کے ہاں جاتے تو دعائیں پڑھ پڑھ کر دم کرتے تھے۔ ایسا کم ہوتا تھا کہ کوئی اس کے ہاں جائے اور پٹ کر نہیں تو ڈانٹ سنے بغیر چلا آئے۔ ایک دن اتفاق یہ ہوا کہ مہتمم نے ٹیگور کو طلب کیا یہ خبر سنتے ہی ان کے ہوش گم ہو گئے مگر جانا ضروری تھا اس لئے یہ سمجھکر کہ جو کچھ ہونا ہے ہو کر ہی رہے گا۔

سہمے ہوئے اور ڈرے ہوئے پہنچے مگر جوں ہی انہوں نے کمرہ میں قدم رکھا ان کے کان میں آواز آئی "کیا تم شعر کہتے ہو؟" یہ خلاف توقع سوال سُنکر اول تو انھیں اپنی سماعت پر شبہ ہوا کہ ان کے ہاں شعر و شاعری کا کیا ذکر؟ لیکن جواب دینا لازمی تھا۔ کہنے کے لئے زبان نہ کھلتی تھی اس لئے انہوں نے سر کے اشارہ سے اقرار کرلیا۔ بابو نے پھر کہا "اچھا تو ایک اخلاقی نظم لکھکر لاؤ" اور وہ بدستور اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔

ٹیگور نے دوسرے دن ایک نظم جوں توں کر کے موزوں کر ہی لی اور یہ کہتے ہوئے کہ "آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا" مہتم کے ہاں پہنچے۔ انہوں نے پوچھا "لے آئے نظم؟" ٹیگور نے جواب دیا "جی ہاں"۔ بابو نے ٹیگور کو اپنے ساتھ لیا اور اسکول کی سب سے بڑی جماعت میں گئے۔ یہاں پہنچکر ٹیگور کو نظم سنانے کا حکم دیا۔ مہتم کے سامنے رہنے تک لڑکوں نے اظہار پسندیدگی کیا لیکن ان کے جاتے ہی کچھ کہنے لگے "رابی (ربندر ناتھ کا مخفف) اور یہ نظم کہے! یقین نہیں آتا" بعضوں نے کہا "اللہ کی شان ہم سے چھوٹی جماعت کا لڑکا ایسی نظم کہے کہ ہماری سمجھ میں بھی نہ آئے" ایک بولا "ہٹاؤ بھی! نظم صاف بتا رہی ہے کہ وہ چرائی ہوئی ہے اور اگر کسی کو شبہ ہو تو میں بتا سکتا ہوں کہ وہ کہاں سے لی گئی ہے" غرض جتنے مُنہ اتنی باتیں۔

بات یہ تھی کہ ان دنوں شعر کہنا اتنا عام نہ تھا جتنا کہ آج سینکڑوں ہزاروں میں ایک آدھ شاعر ہوتا تھا اور لوگ شاعر کے نام سے کان کھڑے کرتے تھے اور حیرت کے ساتھ اس کا منہ تکتے تھے۔ مگر آج کل تو نانوی تعلیم بھی

ختم نہیں ہوتی اور لڑکے شعر کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ اب اگر کوئی لڑکا شاعر نہیں ہے تو لوگ تعجب کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔

بنگال اکیڈمی نارمل اسکول کے بعد ٹیگور بنگال اکیڈمی میں شریک کرائے گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا مدرسہ تھا اور مالی مشکلات کی وجہ سے اکثر دقت پیش آتی تھی۔ ٹیگور اور ان کے خاندان کے دوسرے افراد جو یہاں تعلیم پاتے تھے چونکہ فیس برابر ادا کر دیتے تھے اس لئے ان کے ساتھ بڑی رعایت ہوتی تھی اور ٹیگور جیسے تنہائی پسند اور غیر زبان کی تعلیم میں کم سے کم دلچسپی لینے والے لڑکے کو بڑی سہولت تھی۔ مدرسہ کے اعلیٰ عہدہ داروں نے اساتذہ سے کہدیا تھا کہ ٹیگور کو پڑھائی کے بارے میں سختی نہ کریں۔

ہمالہ کی سیاحت گیارہویں سال ٹیگور کی زنار بندی کی رسم ہوئی اور اسی سلسلہ میں دستور کے موافق ان کا سر مونڈھ دیا گیا۔ بنگال اکیڈمی میں اس ہیئت سے جانا ٹیگور کو پسند نہ تھا۔ وہ جھینپ رہے تھے کہ شریر لڑکے ان کا مذاق اڑائیں گے۔ خدا کی کرنی یوں ہوئی کہ ایک دن جبکہ وہ اسی پریشانی میں الجھے ہوئے تھے ان کے والد نے انھیں بلوا بھیجا اور پوچھا "رابی! کیا تم میرے ساتھ ہمالہ چلنے آمادہ ہو؟" ٹیگور نے سوچا کہ نیکی اور پوچھ پوچھ۔ اس لئے فوراً ہی جواب دیا "ضرور!"

کچھ دنوں بعد ٹیگور اپنے باپ کے ساتھ کلکتہ سے بالپور پہنچے۔ یہاں سے الہ آباد ہوتے ہوئے امرتسر، اور پھر وہاں سے سیدھا ہمالہ کی برف پوش چوٹیوں پر۔ اس سفر میں ٹیگور کے والد نے انھیں بڑی آزادی دے رکھی تھی۔

وہ صبح اور شام اپنے ساتھ لے کر گھومتے اور ان اوقات کے علاوہ ٹیگور کو تنہا بھی سیر و تفریح کے لئے چھوڑ دیتے۔ شروع شروع میں تو ٹیگور اس آزادی سے گھبرائے کیونکہ برف سے ڈھکی ہوئی اونچی اونچی چوٹیاں، کشادہ اور غیر آباد میدان، سردی کی شدت، ایسی غیر مانوس فضا پیدا کرتے تھے کہ ان کا دل لرز جاتا تھا۔ لیکن ان کے والد ہر وقت ان کا دل بڑھاتے اور اپنے تجربات بیان کر کے ان کے حوصلے بلند کرتے تھے۔

سینٹ زیویر چند مہینوں بعد ٹیگور کو کلکتہ واپس بھیج دیا گیا۔ اس دفعہ جب وہ گھر آئے ہیں تو اپنے اندر ایک خاص تبدیلی محسوس کرتے تھے اپنی سیاحت کی لمبی چوڑی لیکن مزیدار داستان وہ کچھ اس انداز میں سنانے لگے کہ سارا گھر ان کا گرویدہ ہو گیا۔ اپنی اس ہر دل عزیزی سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے بنگال اکیڈمی کی شکایت شروع کی اور وہاں جانے سے صاف انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سینٹ زیویر میں شریک کرایا گیا۔ یہاں ایک ہسپانوی استاد "فادر ڈی پینی انڈا" ان کی نظروں میں خاص اہمیت حاصل کرنے لگا۔ اس کی شخصیت بہت جاذب نظر تھی اور وہ بیحد ہمدرد اور بڑے اچھے اخلاق کا انسان تھا۔ دوسرے لڑکے اس کی باتوں کی کم پروا کرتے تھے لیکن ٹیگور کو اس سے بہت انس ہو گیا تھا۔ ایک دن وہ ان کی جماعت میں پڑھا رہا تھا۔ اور ٹیگور حسب عادت قدیم قلم ہاتھ میں لئے چپ چاپ بیٹھے کسی گہری سوچ میں غوطہ زن تھے فادر جب ان کے قریب پہنچا تو یہ کیفیت دیکھ کر ان کے پاس کچھ دیر کھڑا ہوا۔ دوسرے لڑکے بدستور لکھنے میں محو تھے اور ٹیگور فادر کی موجودگی سے بھی

لاعلم، اس نے پوچھا کیوں ٹیگور کیا بات ہے کہ تم افسردہ نظر آتے ہو، طبیعت تو اچھی ہے؟"

ٹیگور کے پاس کیا جواب تھا؟ یہ کہنے کی جرأت نہ تھی کہ "طریقہ تعلیم ناقص ہے اس لئے دل نہیں لگتا" اس لئے چپ ہو رہے۔

نظموں کی پہلی اشاعت ٹیگور کی مشق سخن اس قابل ہو رہی تھی کہ ان کی نظمیں شائع کی جائیں۔ پہلی دفعہ "گیا نانکر" نامی ایک ماہوار رسالہ نے ان کی نظم شائع کی اور کچھ ہی دنوں میں ان کا رنگ سخن اتنا پسند کیا گیا کہ ہر مہینہ ان کی کوئی نہ کوئی نظم ضرور شائع ہوتی۔

ان ہی دنوں انھیں ایک عجیب و غریب خیال پیدا ہوا جس کی بنا پر "بھانو سنگھا" کے نام سے وہ نظمیں لکھنے لگے اور "بھانو سنگھا" کو ایک قدیم شاعر بتایا۔ یہ نظمیں "بھارتی" میں چھپتی تھیں اور اتنی مقبول ہوئیں کہ جسکی کوئی انتہا نہیں۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان نظموں پر تبصرہ کرنے والے کو جرمنی سے پی، ایچ، ڈی کی ڈگری مل گئی۔ واقعہ یوں ہوا کہ ڈاکٹر نشی کانتا چٹرجی ان دنوں جرمنی میں ریسرچ کر رہے تھے "بھارتی" وہاں بھی ان کی نظروں سے گذرتا تھا اور "بھانو سنگھا" کی نظمیں انہیں بھی پسند آتی تھیں۔ اسی سلسلہ میں انہوں نے ایک مقالہ "یورپ اور ہندوستانی لرکس" پر لکھا اور جابجا "بھانو سنگھا" کا کلام نمونہ کے طور پر درج کیا۔ یہ مقالہ اتنا پسند کیا گیا کہ انھیں پی، ایچ ڈی کی ڈگری مل گئی۔

بھارتی ٹیگور کے بھائی جیوترندرا نے "بھارتی" جاری کیا اور ان کو عملہ ادارت میں شامل کیا۔ بھارتی کے پہلے نمبر میں انہوں نے ایک تنقید نثر میں

لکھی اور ایک طویل نظم "کاویکاہنی" (شاعر کی کہانی) کے عنوان سے شائع کی کچھ دنوں بعد ان کے ایک دوست نے اس نظم کو کتابی صورت میں شائع کر کے متعجب میں ڈال دیا۔

"کاویکاہنی" ان کی پہلی کتاب تھی اور اس زمانہ کی تصنیف جبکہ نوجوان شاعر نے دنیا کو اچھی طرح آنکھیں کھول کر نہ دیکھا تھا اس کے نشیب و فراز سے واقفیت تھی اور نہ اس کی نیرنگیوں سے آگاہی۔

انگلستان کا پہلا سفر

ان کے بھائی جو احمد آباد میں جج تھے اپنی بیوی بچوں سے ملنے انگلستان جا رہے تھے اور اسی سلسلہ میں انہوں نے ٹیگور کو ساتھ لے جانے کی اجازت والد سے لے لی۔ چھ مہینے احمد آباد میں رہکر ۲۰ ستمبر ۱۸۷۸ء کو انگلستان کے ارادے سے چل پڑے۔ بھائی کا خیال تھا کہ انھیں قانونی تعلیم دلائیں۔ اسی خیال سے سب سے پہلے "برائٹن" کے پبلک اسکول میں شریک کیا گیا۔ کچھ دنوں بعد ان کے بھائی کے دوست مسٹر پالٹ کے مشورے سے لندن میں رکھا گیا۔ رہائش کا انتظام ریجنٹ پارک کے بالکل مقابل تھا۔ یہاں کی دنیا ہی نئی تھی اور ٹیگور کو یہاں ایک خاص قسم کا تکلف ہونے لگا۔ یہاں سے مسٹر بارکر کے مکان میں منتقل کیا گیا۔ یہ عموماً طالب علموں کو امتحان کی تیاری کراتے تھے اور اسی نقطہ نظر سے ان کی نگرانی ٹیگور کے لئے مفید خیال کی گئی۔ چند مہینے بعد یہ مقام بھی چھوڑ نا پڑا اور اس دفعہ ڈاکٹر اسکاٹ کے ساتھ رہائش تجویز کی گئی۔ یہاں ٹیگور نے حقیقی دلچسپی محسوس کی مسز اسکاٹ اور ان کی لڑکیوں کا برتاؤ اتنا شریفانہ اور دوستدارانہ تھا

کہ انھیں اپنے مکان کا لطف آنے لگا۔ بہت جلد وہ ان کی صحبت میں گھل مل گئے اور اپنے آپ کو بیگانہ محسوس نہ کرنے لگے۔

تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ ان کے بھائی ہندوستان واپس ہو رہے تھے اور ان کے والد نے لکھا تھا کہ ٹیگور کو بھی ساتھ لائیں۔ اس طرح اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر وہ گھر واپس ہو گئے۔

مغربی موسیقی کے اثرات ٹیگور ابھی "برائٹن" ہی میں تھے کہ انھیں ایک جلسہ موسیقی میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا مغربی موسیقی پر غور و فکر کرنے کا سب سے پہلے انھیں یہیں موقع ملا۔ جو نقوش ان کے دل پر مرتسم ہوئے اس کی بناء پر ان کا خیال ہے کہ مغربی موسیقی اگر انھیں اپنی طرف کھینچتی ہے تو محض اس لئے کہ اس میں "رومانیت" ہے زندگی کے بےشمار پہلو اپنے اصلی خط و خال میں اس کے ذریعہ سے جھلکائے جاسکتے ہیں اور احساسات کی دنیا میں اس کے ذریعہ سے ایک ہیجان پیدا کیا جاسکتا ہے ظاہر ہے کہ اس صورت میں وہ مادیات سے تعلق رکھتی ہے۔ برخلاف اس کے ہندوستانی موسیقی ظاہری چیزوں کا کوئی خیال نہیں رکھتی، مادیات سے اسے دور کا بھی تعلق نہیں، اور سطحی احساسات سے اُسے واسطہ نہیں۔ وہ دل کی گہرائیوں میں چپکے چپکے ڈوب جاتی ہے اور روحانی جذبات کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کرتی ہے۔

اب بھی ٹیگور کا یہ خیال ہے کہ ہندوستانی موسیقی کا مغربی موسیقی سے مقابلہ کرنا غلطی ہے کیونکہ اِس کا اصول دوسرا ہے اور اُس کا دوسرا، ان کے

درمیان اختلافات کی ایک خلیج حائل ہے، وہی جو مادیت اور روحانیت کے درمیان ہو سکتی ہے۔ اس لئے ان میں مماثلت کی بجائے مغائرت نمایاں ہے۔

انگلستان سے واپسی پر ٹیگور نے گھر میں جو نظمیں سنائیں ان کے لئے کچھ مغربی تھی اور آواز کا اتار چڑھاؤ بالکل ہی مغربی طرز کا تھا۔ اس لئے گھر والوں نے اس تبدیلی کو فوراً ہی محسوس کر لیا اور ہر طرف سے سوالات ہونے لگے" رابی کی آواز کو کیا ہو گیا، کتنی بھونڈی ہو گئی ہے کہ ہنسی آنے لگتی ہے!"

اسی ملے جلے اثر کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے ایک موسیقیانہ طربیہ "والمیکی پراتی بھا" لکھی۔ یہ اسٹیج کے لئے لکھی گئی تھی اور موسیقی سے دلچسپی رکھنے والے اس کو سُن کر لطف اٹھا سکتے تھے۔ اس کی راگنیاں ہندوستانی اور مغربی ترنم کو سمو کر بنائی گئی تھیں۔ اس سلسلہ میں بعض جگہ ان کے بھائی جیوتر ندرا نے بھی مدد کی تھی اور دو ایک راگنیاں ان کی فکر کا بھی نتیجہ تھیں۔ علاوہ اس کے دو ایک مغربی راگنیاں پوری کی پوری شریک کر لی گئی تھیں۔

اس کی کامیابی نے ٹیگور کو ایک اور ڈراما اسی طرز میں لکھنے پر آمادہ کیا۔ اس کا نام "کال مری گایا" تھا۔ اس کے بعد تیسرا ڈراما "مایا کھیلا" معرض وجود میں آیا۔

یہ ڈرامے اسٹیج کئے جاتے تھے اور ٹیگور ان میں نمایاں اداکار کی حیثیت سے جلوہ گر ہوتے تھے۔

اُن دنوں ٹیگور کا سارا خاندان موسیقی اور ڈراما کی دنیا میں گم سُم تھا۔ ہر فرد کو اس سے گہری دلچسپی تھی اور جہاں تک ممکن ہو سکتا تمثیل کو کامیاب

بنانے میں کوشش کی جاتی تھی۔

شام کے گیت ٹیگور کے بھائی جیوترندرا اور ان کی بیوی سیاحت کے لئے باہر گئے ہوئے تھے۔ ٹیگور نے موقع سے فائدہ اٹھاکر ان کے کمروں پر اپنا قبضہ جمایا۔ یہ کمرے اوپر کی منزل پر تھے اور یہاں ٹیگور گھر بار سے علٰحدہ بالکل الگ تھلگ رہتے تھے۔ اسی تنہائی میں انھیں موقع ملا کہ وہ اپنے داخلی رجحانات کا جائزہ لیے۔

جب کبھی وہ اپنی طبیعت موزوں پاتے سلیٹ لے کر لکھنے بیٹھتے۔ حالات کے تحت انھیں بیاض سے زیادہ مفید سلیٹ معلوم ہوئی کیونکہ بیاض میں سوچ سمجھکر لکھنا پڑتا۔ کاٹنا، چھانٹنا اور ردو بدل ذرا مشکل تھا لیکن سلیٹ پر حروف آسانی سے مٹائے جاسکتے تھے اس لئے انھوں نے بے تکان نظمیں لکھنی شروع کیں ان نظموں کی دو خصوصیتیں تھیں ایک تو یہ کہ ان میں خالص داخلی تاثرات جھلک رہے تھے اور دوسرے یہ کہ روانی اور سلاست بلا کی تھی۔ یہ نظمیں "شام کے گیت" کے مجموعہ میں شامل ہیں۔

صبح کے گیت جیوترندرا میوزیم کے قریب "سڈر اسٹریٹ" میں علٰحدہ مکان کرایہ پر لے کر ٹھہرے ہوئے تھے اور ٹیگور بھی ان ہی کے ساتھ مقیم تھے۔ ایک صبح وہ ورانڈے میں کھڑے مشرق کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دور، جہاں آسمان زمین سے ملتا نظر آتا ہے، آفتاب اپنا سرخ چہرہ بادلوں کے لحاف سے نکال کر جھانک رہا تھا۔ انھیں ایسا محسوس ہونے لگا کہ انکی آنکھوں کے آگے سے پردہ اٹھ رہا ہے۔ اب تک وہ صرف چہرہ کی آنکھوں سے

ہی دنیا کو دیکھتے تھے مگر اب دل کی آنکھیں بھی منور ہوگئیں اور اس کا اثر یہ ہوا کہ کائنات کا ذرہ ذرہ تابندہ نظر آنے لگا۔

بچے ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈالے اچھلتے کودتے رواں دواں ہوتے تو یہ ایک طفلانہ حرکت نہیں بلکہ شاعر کو اس میں ایک حیات تازہ نظر آتی۔ دوستوں کا قہقہے لگانا، ماں کا بچہ کو چومنا، ایک گائے کا دوسری گائے کو زبان سے چاٹنا، ایسی حرکتیں تھیں جن کو آج سے پہلے بھی ٹیگور نے بارہا دیکھا تھا مگر اب اُن ہی میں ایک تازگی اور ایک نئی روح جلوہ گر نظر آتی تھی ان ہی دنوں شاعر نے کہا:-

"مجھے نہیں معلوم کہ کس طرح میرے دل نے اپنے سارے
جھروکے کھول دئے کہ ان کے ذریعہ مجھ میں ساری دنیا
سما جائے"۔

ان نظموں کا مجموعہ "صبح کے گیت" کے نام سے موسوم ہے۔

شادی کاروار میں ان کے بھائی جج تھے۔ یہیں انہوں نے دسمبر ۱۸۸۳ء میں شادی کر لی۔ اس زمانہ کی یادگار ایک ناول "راجارشی" ہے۔ "مباحثے" نامی ایک تنقیدوں کا مجموعہ بھی شائع کیا۔ یہ سیاسی، معاشرتی اور تعلیمی اصلاح کے میدان میں پہلا قدم تھا۔

"انتقام فطرت" کے عنوان سے ایک ڈرامائی نظم لکھی۔ اس کا ہیرو ایک سنیاسی تھا جو فطرت پر قابو پانے کے لئے نفس کشی کرتا ہے۔

ان ہی دنوں دوبارہ یورپ جانے کا موقع ملا۔ اس دفعہ انہوں نے

مغربی موسیقی میں خاص دلچسپی لی اور واپس ہو کر ان کا ارادہ بچپن کی خواہش کو پورا کرنا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ کلکتہ سے پشاور تک بیل گاڑی میں سفر کریں مگر ان کے والد نے زمینداری کے کاروبار سنبھالنے کے لئے انھیں "شیلدا" بھیجدیا۔ یہاں پہلی دفعہ انھیں زراعت پیشہ طبقہ سے بلا واسطہ تعلق پیدا ہوا۔ ان کی مشکلات اور افلاس سے ان کو دلی ہمدردی پیدا ہوئی اور عملی طور پر دیہات سدھار کا نظام العمل انہوں نے مرتب کیا۔

افسانے اور ناول ٹیگور نے اب افسانے بھی لکھنے شروع کیے جو ملک کے مختلف رسائل میں شائع ہو کر مقبول ہونے لگے۔ ان کے افسانوں میں سنسنی خیز یا گنجلک پلاٹ نہیں ہوتا۔ سیدھا سادا طرز بیان اور حد درجہ جاذب نظر اسلوب ہی کی مدد سے وہ افسانہ لکھتے ہیں مگر سیرت اور کردار نگاری ان کے ہاں درجہ کمال تک پہنچ جاتی ہے۔ خصوصاً عورت کے کردار کی جزئیات تک کو ان کا قلم بغیر ظاہر کیے نہیں چھوڑتا۔ وفاداری اور خدمت گزاری کو وہ ہندوستانی عورت کی نمایاں خصوصیتیں سمجھتے ہیں اور اکثر و بیشتر ان ہی کو اجاگر کرتے ہیں۔

افسانوں کے علاوہ انہوں نے متعدد ناولیں بھی لکھے اور ان سب میں وہی خصوصیات نمایاں کیے جو ان کے مختصر افسانوں میں عام طور پر دکھائی دیتے ہیں "گورا" جو سنہ ۱۹۱۰ء میں لکھا گیا غالباً ان کا پہلا ناول ہے۔ اس کے علاوہ ناولوں اور افسانوں میں "ہوم اینڈ دی ورلڈ" "دی رک" "ہنگری اسٹونس" "ماشی" اور دوسرے افسانے "بر دکن ٹائیز" وغیرہ بہت مشہور رہیں۔

ڈرامے ان کے ڈراموں میں جذبات کی ترجمانی عموماً نفسیاتی اصول پر ہوتی ہے، تصوف اور حکیمانہ نظریوں پر شاعری کا رنگ چڑھا ہوا ہوتا ہے اور وہ سراسر موسیقی میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ ابتدائی دور میں شاعر نے مجاز کی رنگا رنگیوں میں اپنے آپ کو کھویا ہوا پایا اور اسی نقطۂ نظر سے قربانی انتقامِ فطرت۔ مالنی۔ چترا۔ مایا کھیلا وغیرہ ڈرامے لکھے۔ لیکن ایک وقت وہ بھی آیا جب دنیا کے نشیب و فراز نے شاعر کو مجاز سے حقیقت کی طرف پلٹا دیا اور اُن کی نظریں ظاہر سے گذر کر حقیقت تک پہنچ گئیں۔ اس زمانہ کی یادگار ڈاک گھر، حلقہ بہار وغیرہ ہیں۔

گیتان جلی گیتان جلی نظموں کا وہ مجموعہ ہے جس کی اشاعت سے ادبی دنیا میں ایک ہلچل مچ گئی۔ اس کا انگریزی ترجمہ لے کر جب ٹیگور انگلستان پہنچے ہیں اور مسٹر ایٹ مشہور آئرلینڈ کے ملک الشعرا کو دکھاتے ہیں تو ان کی ادبی زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ مسٹر ایٹ نے ان نظموں کو اتنا پسند کیا کہ وہ ایک عرصہ تک اس کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے، گھر میں ہوں یا ریل میں، بس میں ہوں یا ہوٹل میں، کلب میں ہوں یا پارک میں غرض ہر جگہ وہ اس کا مطالعہ کرتے نظر آتے تھے۔ ان نظموں کو صرف مسٹر ایٹ ہی نے پسند نہیں کیا بلکہ دوسرے ممتاز شعرا اور نقادوں نے بھی اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ عوام میں ہر دل عزیزی کا یہ عالم ہوا کہ متعدد اڈیشن اس کے انگلستان سے شائع ہوئے اور دنیا کے مختلف حصوں میں انگریزی داں اصحاب کے ہاتھوں میں پہنچ گئے۔ یورپ کی مختلف زبانوں میں بھی ترجمے ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا

جبکہ بنگالی زبان میں گیتان جلی کا پہلا اڈیشن ہی ختم نہ ہوا تھا۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ٹیگور کی شاعری کا چرچا پہلے مغرب میں ہوا اور ہندوستان نے ان کی عظمت کا حال اہل مغرب سے معلوم کیا۔

نوبل انعام ۱۹۱۳ء میں ٹیگور کو ادب کا نوبل انعام ملا۔ اب وہ دنیا کے مایۂ ناز شاعر تھے اور ان کی ادبی حیثیت ملک و قوم کی چار دیوار میں محدود نہ تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ نوبل انعام ایک ہندوستانی کو دیا گیا۔ اس لئے ایک طرف تو دنیا والے اس شاعرِ اعظم سے بڑے مرعوب ہوئے اور دوسری طرف خود ہندوستانیوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کیونکہ انعام ملنے سے تقریباً چھ سال پہلے جبکہ کلکتہ یونیورسٹی میں سر آسو توش مکرجی نے انھیں ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری دینے کی تحریک پیش کی تھی تو ارکان نے یہ کہکر نامنظور کیا تھا کہ ٹیگور غلط بنگالی لکھتے ہیں۔ ۱۹۱۴ء میں انھیں "سر" کا اعزاز ملا۔

گارڈنر اور کرسنٹ مون گیتان جلی کے بعد گارڈنر اور کرسنٹ مون" نظموں کے دو مجموعے شائع ہوئے۔ گارڈنر کا موضوع گیتان جلی سے بالکل علیحدہ ہے اور اگر گیتان جلی کو مناجات یا خدا سے راز و نیاز کہا جا سکتا ہے تو گارڈنر کو عشق و محبت کی داستان کہا جا سکتا ہے۔ کرسنٹ مون کا موضوع بالکل ہی جداگانہ ہے۔ اس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ ایک بچّے کو مختلف حیثیتوں سے ہماری سماج سے کیا تعلق ہے علاوہ اس کے معصوم بچّے کی روحانی قوتوں کو اُجاگر کیا گیا ہے۔

شانتی نکیتان بچپن ہی سے ٹیگور کو طریقہ تعلیم ناپسند تھا اور ان دنوں

سوائے اس کے اور کچھ نہ کر سکتے تھے کہ خود تعلیم میں دلچسپی نہ لیں لیکن جب حالات موافق ہوئے تو انہوں نے بالپور میں ایک آشرم کا سنگِ بنیاد رکھا جو بعد میں مدرسہ اور آخر میں ایک بین القوامی جامعہ کی صورت میں مشہور ہوگیا۔

ابتدا ہی سے ان کا یہی خیال رہا ہے کہ بچوں کو اپنے طور پر نشو و نما پانے دیا جائے تاکہ فطرت کی وہ قوت جو ان میں پوشیدہ ہے اپنے اصلی خط و خال میں ظاہر ہو سکے۔ اس اصول پر شانتی نکیتان کا نصاب تعلیم مقرر ہے۔ مناظر قدرت سے استفادہ کرنے اور فطری رجحانات کی پیروی کرنے کے ہر امکان کو یہاں آزادئ عمل حاصل ہے۔ مذہب و ملت، صنف اور عمر کی کوئی قید نہیں اور ہر جہت سے تزکیہ نفس اور روحانی ارتقا مقصود ہے۔

جب آشرم اور مدرسہ ایک عرصہ تک نہایت کامیابی کے ساتھ چلتا رہا تو انھیں اس کی وسعت کا خیال پیدا ہوا لیکن جنگ عظیم کی ہنگامہ آرائیوں نے انھیں اس کی تبلیغ سے روکا۔ آخر ۱۹۲۰ء میں یورپ جانے کا موقع ملا۔ وہاں تعلیم کا یہ نیا پیغام لوگوں کے کانوں تک پہنچا کر امریکہ گئے جہاں ان کو زیادہ تائید حاصل ہوئی۔ ہر مقام پر انہوں نے طریقہ تعلیم کا غائر نظروں سے مطالعہ کیا اور بڑے بڑے مفکرین سے تبادلہ خیال کیا۔ اسی سلسلہ میں انہوں نے اپنے شخصی اثرات اور اپنے تعلیمی پیغام کی بنا پر بعض غیر ملکی علماء و فضلاء کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ شانتی نکیتان میں چلے آئیں۔ چنانچہ اب ہندوستانی علماء کے علاوہ جرمنی، روس، ایران، اور امریکہ وغیرہ کے پروفیسر درس و تدریس کے لئے موجود ہیں۔

یہاں کی طرز تعلیم کچھ اس طرح کی رکھی گئی ہے کہ لڑکوں کو ایک تو فرقہ پرستی، ذات پات اور قوم و مذہب کے تعصب سے دور رکھا جاتا ہے اور دوسرے یہ کہ ان کی روح کو آزاد رکھکر فطری رجحان اور قدرتی نشو ونما کو ترقی دی جاتی ہے۔

قوم پرستی ٹیگور کو یقیناً اپنے ملک اور اپنی قوم سے گہری دلچسپی ہے، اس کی پستی پر وہ آنسو بہاتے ہیں، اس کے افلاس پر وہ تنگدل نظر آتے ہیں، اس کی غلامی پر وہ مغموم ہوتے ہیں اور اس کی ترقی کے ذرائع سوچتے ہیں لیکن جس طرح وہ نہیں چاہتے کہ دوسرا ملک ہندوستان کو غلام بنالے اسی طرح وہ اس کو بھی گوارا نہیں کرتے کہ ہندوستان دوسرے ملک پر آرے چلائے وہ استبداد کو ناپسند کرتے ہیں اور ہمیشہ مظلوم کا ساتھ دیتے ہیں، اگر ہندوستانی مظلوم ہیں تو یقیناً وہ ان کی ہمدردی حاصل کرسکتے ہیں اور اگر ظالم تو وہ ان کی مخالفت پر کمر کسیں گے۔ یہی جذبہ کارفرما تھا جبکہ انہوں نے جلیان والا باغ کی روح فرسا المیہ سے متاثر ہوکر "سر" کا خطاب حکومت کو واپس کردیا۔

گاندھی نے جب آواز بلند کی کہ "حیوانی قوت کا مقابلہ روحانی قوت سے کیا جائے" تو ٹیگور نے بھی اتفاق کیا مگر جب عدم تعاون کی تحریک پیش کی تو ٹیگور نے مخالفت کی۔ وہ لکھتے ہیں:۔

> "عجیب اتفاق ہے کہ میں یورپ میں مشرق و مغرب کے
> تمدن کو سمونے کا انتظام کررہا ہوں اور سمندر کے اس
> پار میرے ہم وطن عدم تعاون کی خلیج حائل کر رہے ہیں"

جواہر لال نہرو



جواہر لال نہرو

جواہر لال نہرو

آبا و اجداد جواہر لال کے جدِ اعلیٰ راج کنول کشمیر کے مشاہیر میں سے تھے اِن کی قابلیت سنسکرت اور فارسی میں بہت اچھی تھی۔ شہنشاہ فرخ سیر جب کشمیر آئے تو اِن کی لیاقت سے بہت متاثر ہوئے اور دہلی چلنے کے لئے کہا۔ یہ واقعہ ۱۷۱۶ء کا ہے۔ شہنشاہ نے جاگیر اور ایک عمدہ مکان نہر کے کنارے انہیں عطا کیا۔ اور اِسی عطیہ کے بعد سے ان کے نام کے بعد نہرو (نہر سے) کا اضافہ کیا گیا۔ کنول خاندانی نام تھا۔ اِس لئے ان کی اولاد کنول نہرو پکاری گئی۔ لیکن ایک عرصہ بعد کنول حذف کر دیا گیا۔ اور یہ خاندان نہرو کے نام سے شہرت پایا۔ مغلیہ شہنشاہی کا چراغ گل ہونے کے بعد اس خاندان نے انگریزی حکومت میں ملازمت کر لی۔ جواہر لال کے پڑدادا لکشمی نارائن نہرو "سرکار کمپنی" کے پہلے وکیل مقرر ہوئے۔ اِن کے دادا گنگا دہر نہرو دہلی کے کوتوال ہوئے۔

۱۸۵۷ء کے غدر کی ہنگامہ آرائیوں نے اس خاندان کا شیرازہ بکھیر دیا۔ سارے خاندانی اسنادات تلف ہو گئے اور دولت لوٹ کھسوٹ میں ہاتھوں سے نکل گئی۔ جان بچی لاکھوں پائے سمجھ کر اکثر افراد نے بیک بینی و دو گوش آگرہ کا رخ کیا۔ جواہر لال کے والد ابھی اس دنیا میں آئے نہ تھے لیکن ان کے دو چچا ہوش سنبھال چکے تھے۔ کچھ عرصہ بعد مئی ۱۸۶۱ء میں آگرہ میں ان کے والد پنڈت موتی لال نہرو آنجہانی پیدا ہوئے۔ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ ہندوستان کے شاعر اعظم رابندر ناتھ ٹیگور بھی اسی دن اسی مہینہ اور اسی سال پیدا ہوئے۔ چونکہ جواہر لال کے دادا کا انتقال ہو چکا تھا اس لئے اس بڑے خاندان کا بار ان کے دونوں چچاؤں پر پڑا۔ ایک چچا نے حکومت کے محکمۂ عدالت میں ملازمت کر لی اور دوسرے نے کھتری اسٹیٹ میں دیوانی کا عہدہ حاصل کر لیا۔ ہائیکورٹ آگرہ سے الہ آباد میں منتقل ہوا اور چونکہ ان کے چچا کا تعلق اسی سے تھا اس لئے ان کے چچا مع خاندان کے الہ آباد چلے آئے۔ الہ آباد پہنچکر ان کے چچا نے وکالت شروع کر دی اور تھوڑے ہی عرصہ میں صف اول میں جگہ مل گئی۔ موتی لال نہرو کی تعلیم کا سلسلہ یہاں جاری رہا۔ لیکن وہ بحیثیت طالب علم کچھ زیادہ نہیں چمکے اور ہر امتحان میں بمشکل پاس ہوتے رہے حتیٰ کہ جب بی۔ اے کے امتحان کا وقت آیا تو بھی ان کی لاپرواہی باقی رہی اور اس امتحان کا ایک پرچہ کر کے وہ اس قدر بد دل ہوئے کہ انہوں نے باقی پرچوں میں بیٹھنا وقت ضائع کرنا خیال کیا۔ لیکن بعد کو ان کے پروفیسر کی زبانی معلوم ہوا کہ ان کا پہلا پرچہ اتنا خراب نہ تھا کہ امتحان کا خیال

سرے ہی سے چھوڑ دیتے۔ بہر حال اُنھوں نے اپنی جامعاتی زندگی ختم کردی اور پیشہ پسند کرنے کی فکر کی ۔ وکالت کی طرف اُن کا بچپن سے رجحان تھا اور وہ اِسے حد درجہ پسند کرتے تھے۔ علاوہ اس کے اپنے بھائی کی کامیابی بھی مدِ نظر تھی۔ اسی خیال سے وہ وکالت کے امتحان میں شریک ہوئے۔ اور یہاں وہ پہلی دفعہ امتیاز کے ساتھ کامیاب ہوئے۔ سارے امیدواروں میں اول آئے اور طلائی تمغہ بھی حاصل کیا۔ کانپور میں اُنھوں نے اپنی وکالت کا آغاز کیا اور تین سال بعد وہ الہ آباد ہائیکورٹ میں آگئے۔ اس اثنار میں ان کے بھائی کا انتقال ہوگیا اور ان کے مقدمے بھی ان کے ہاں آنے لگے۔ موتی لال نے اپنے آپ کو اس کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اور وہ تعطیلات اور فرصت کے لمحات بھی بغیر صحت کا خیال کئے مقدمات کی تیاری میں صرف کرتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ بہت جلد ان کا شمار الہ آباد کے چوٹی کے وکلار میں ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ ان کی آمدنی بڑھتی گئی اور بڑھتی گئی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ طریق معاشرت بھی بدلتا گیا۔ مغربی طرز رہائش پر بے شمار دولت دِل کھول کر صرف ہونے لگی۔

جواہر لال کی پیدائش اور بچپن

۱۴ر نومبر ۱۸۸۹ء کو الہ آباد میں جواہر لال پیدا ہوئے۔ ہندوستانی طرز معاشرت کے لحاظ سے نہرو کا سارا خاندان ایک ہی گھر میں رہتا تھا لیکن جواہر لال سب بچوں سے چھوٹے تھے۔ اس لئے کوئی انھیں خاطر میں نہ لاتا تھا۔ نہ ان کے ساتھ کوئی کھیلتا۔ نہ انھیں کسی تفریح میں شریک کیا جاتا اور نہ

شرارتوں میں ساتھ لیا جاتا۔ ان ہی اسباب کی بناء پر جواہر لال کو تنہائی میں مجبوراً رہنے کی کچھ عادت سی ہو گئی اور گو کہ شروع شروع میں انہیں تکلیف ہوئی تھی لیکن بعد میں طبیعت کو تنہائی سے اُنس ہو گیا۔ مغربی معاشرت کی پیروی کے سلسلہ میں ان پر ایک انگریز "گورنس" تھی۔ جواہر لال اپنی ماں سے جن کا تعلق بھی کشمیر سے تھا زیادہ مانوس تھے بہ نسبت اپنے باپ کے اس لئے نہیں کہ موتی لال اُس زمانہ میں ذرا تند مزاج واقع ہوئے تھے اور ایک دن جبکہ ان کی عمر ۵ یا ۶ سال کی ہو گی باپ کا ایک فاونٹن پن چھپا لینے کے الزام میں خوب پیٹے تھے اور اسی سبب سے ڈرتے تھے، بلکہ محض اس وجہ سے کہ ان کی ماں انہیں حد سے سوا چاہتی تھی اور چوبیس گھنٹے ساتھ رہنے سے اُنس زیادہ ہو گیا تھا۔ اپنی ماں کے سوا جواہر لال کو اپنے باپ کے منشی مُبارک علی سے بھی خاص لگاؤ ہو گیا تھا۔ منشی جی ۱۸۵۷ء کے غدر کے ستائے ہوئے تھے۔ وہ اچھے خاندان کے فرد تھے لیکن غدر نے ان سے دولت، وجاہت اور حیثیت سب کچھ چھین لی تھی اور ان فلک کے ستائے ہوئے منشی جی کو موتی لال نے اپنے ہاں ملازم رکھ لیا تھا۔ ان کی سفید داڑھی نے جواہر لال کی نظروں میں ایک خاص وقعت پیدا کر لی تھی۔ ان کا خلوص جواہر لال کی کشش کا باعث ہوا اور ان کی شفقت نے جواہر لال کا دل موہ لیا۔ وہ اکثر الف لیلہ کے قصے بیان کرتے تھے۔ اور جواہر لال انہیں حیرت واستعجاب کے عالم میں سنا کرتے تھے۔ ایک عرصہ بعد جبکہ جواہر لال ہوش سنبھال

چکے تھے منشی جی نے انتقال کیا۔ لیکن جواہرلال کے دِل میں اب تک ان کی یاد باقی ہے۔

مذہبی تہواروں اور پوجا پاٹ کے فرائض میں عورتوں کی سرگرمی خصوصیت رکھتی ہے۔ جواہرلال کے خاندان میں بھی ان معاملات میں عورتوں ہی کا دخل تھا۔ مرد اور وہ بھی نوجوان مغربی طرز کے پیروان کی پابجائی سے اکثر قاصر رہا کرتے تھے لیکن عورتیں کمسن ہوں کہ مسن ادائی فرایض میں کبھی کوتاہی نہ کرتی تھیں۔ جواہرلال کی عمر ابھی اس قابل نہوئی تھی کہ اِن سب میں سمجھ بوجھ کر حصہ لیا جاتا اس لئے وہ محض نقل کرنے پر ہی اکتفا کرتے۔ عید اور تہواروں کے موقع پر رنگ رلیاں منانا مٹھائیاں کھانا اور نئی نئی پوشاکیں پہننا ہی ان کے لئے سب کچھ تھا۔ اس سے آگے وہ کچھ نہ جانتے تھے۔ اس خصوص میں وہ سب سے زیادہ اہمیت اپنی سالگرہ کو دیتے تھے اس وجہ سے کہ وہی ایک تقریب ایسی ہوتی تھی جس کے وہ ہیرو ہوتے تھے۔ اور ہر شخص اِن کو کچھ نہ کچھ تحفہ دیتا اور ان کی آؤ بھگت کرتا تھا۔ اسی وجہ سے وہ دِل ہی دِل میں ہمیشہ اور علی الاعلان بعض دفعہ کہا کرتے تھے کہ یہ تقریب سال میں صرف ایکدفعہ کیوں آتی ہے جبکہ دوسری عیدیں اور تقاریب سال میں کئی کئی دفعہ آتی ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ یہ اتنے انتظار کے باوجود بھی دیر سے آئے؟ مگر انھیں اُس وقت یہ کہاں معلوم تھا کہ ایک وقت وہ بھی آئے گا جبکہ ہر سالگرہ بڑھتی ہوئی عمر کا بھیانک پیغام لائیگی۔ اور سال میں کئی کئی دفعہ

اس کی آرزو کرنا تو کُجا سال میں ایک ہی دفعہ اس کا آنا وبال جان ہوجایئگا۔

انند بھون جواہر لال کی عمر ۱۰ سال کی تھی کہ ان کے والد نے ایک نیا مکان جو ان کے پچھلے مکان کی بہ نسبت بہت وسیع تھا بنایا۔ اور نہرو خاندان اس میں منتقل ہوگیا۔ اس کا نام "انند بھون" تھا۔ یہ مکان آج بھی کافی شہرت رکھتا ہے۔ اور غالباً اس کا چرچا کانگریسی کاروبار کے سلسلہ میں زیادہ ہوا۔ جواہر لال کو اس مکان کی دو چیزیں زیادہ پسند تھیں۔ ایک تو اُس کا عمدہ باغیچہ۔ دُوسرا تیرنے کا بڑا حوض۔ آخر الذکر سے خصوصاً ان کی دلچسپی بڑھتی گئی اور بہت جلد انہوں نے اچھا تیرنا سیکھ لیا۔ دِن میں کئی کئی مرتبہ جب ان کا دل نہ لگتا تھا یہ فوراً اس میں غوطہ زن ہوتے تھے۔ ان کے والد گو اچھا تیرتے نہ تھے لیکن سہ پہر میں عموماً اپنے دوستوں کے ہمراہ ضرور تیرنے آتے۔ سر تیج بہادر سپرو بھی جو ان دنوں الہ آباد ہائیکورٹ میں جونیر تھے، اکثر موتی لال کے ساتھ تیرنے چلے آتے لیکن نہ انھیں تیرنا آتا تھا اور نہ سیکھنے کے خواہشمند تھے۔ گہرے پانی میں قدم رکھنے سے بہت گھبراتے تھے زیادہ سے زیادہ کمر برابر پانی میں کھڑے ہوکر چھینٹے لڑا کرتے تھے۔

اساتذہ جواہر لال کی تعلیم کے لئے ایک پنڈت جی مقرر تھے۔ جو سنسکرت اور ہندی پڑھاتے تھے اور موقع بے موقع مذہبی فرائض سے بھی آگاہ کیا کرتے تھے۔ لیکن ان کی کوششوں سے جواہر لال نے بہت کم سیکھا۔ اس میں درصل پنڈت جی کا زیادہ قصور

نہ تھا بلکہ جواہر لال خود ہی لاپروا تھے۔ موتی لال کی ولایت سے واپسی کے بعد ڈاکٹر اینی بسنٹ کی سفارش پر ایک انگریز استاد تعلیم کے لئے مقرر ہوا۔ اس کا نام فرڈینڈ۔ ٹی بروکس تھا۔ تین سال تک جواہر لال اس کی نگرانی میں تعلیم پاتے رہے۔ اسی زمانہ میں انہیں مطالعہ کا شوق ہوا۔ بچوں کے قصے کہانیاں ختم کر کے انہوں نے اسکاٹ۔ ڈکنز۔ تھیاکرے۔ اور ویلز کی کتابیں پڑھنی شروع کیں۔

تھیاسوفی چونکہ فرڈینڈ تھیاسوفسٹ تھا۔ اس لئے وہ کبھی کبھار اس کا ذکر جواہر لال سے کیا کرتا تھا۔ اور بعض دفعہ اس کے کمرے میں اس سوسائٹی کے اجلاس ہوا کرتے تھے۔ جن میں یہ بھی شریک ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ انہیں اس سوسائٹی سے دلبستگی سی ہونے لگی۔ اور حالانکہ وہ ابھی اس قابل نہ تھے کہ اس کے نشیب و فراز کو سمجھ سکیں۔ مگر اس کی خاموش اور جاذب نظر کارروائیوں نے انھیں اس کا طرفدار بنا لیا۔ ایک دن انھیں خواہش ہوئی کہ وہ بھی اس کے ممبر بنیں۔ اس خیال کے ساتھ ہی وہ اپنے والد کے ہاں پہنچے۔ اور اُن سے اس کا ذکر کیا۔ وہ ہنسنے لگے شاید اس وجہ سے کہ جواہر لال کی عمر اس وقت تیرہ سال کی تھی۔ مگر پھر بھی انہوں نے اجازت دیدی۔ جواہر لال ممبر ہو گئے۔ اور چونکہ ان دنوں ڈاکٹر اینی بسنٹ الہ آباد آئی ہوئی تھیں۔ اس لئے انہوں نے خود یہ رسم ادا کی۔ بعد میں جواہر لال کو معلوم ہوا کہ موتی لال بھی اس سوسائٹی کے قدیم ممبر ہیں لیکن ان کی دلچسپیاں ختم ہو گئی ہیں۔

انگلستان کو روانگی ۱۹۰۵ء میں جواہر لال نہرو کا پورا خاندان۔ ماں۔ باپ۔ اور چھوٹی بہن سب کے سب انگلستان کے ارادے سے روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچتے ہی ڈاکٹر ما انصاری مرحوم سے ان کی ملاقات ہوئی جو اس وقت لندن کے اسپتال میں ہوز سرجن تھے۔ اتفاق کی بات ہے کہ "ہیرو" کے ممتاز اسکول میں انھیں فوراً ہی جگہ مل گئی کچھ عرصہ بعد ان کے والدین انگلستان سے واپس ہو گئے۔ چونکہ ان کی عمر ابھی پندرہ برس ہی کی تھی اور اب تک کبھی والدین سے علیحدہ رہنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اس لئے یہ تنہائی شاق گزرنے لگی مگر رفتہ رفتہ بڑھتی ہوئی دلچسپیوں نے مانوس کر ہی لیا۔ جواہر لال کو اسی سال کے "عام انتخابات" سے دلچسپی ہونے لگی۔ اور موقع پر انہوں نے اس کا کافی غور سے مطالعہ کیا۔ ۱۹۰۶ء کی ابتدا میں ایک دن کسی مدرس نے پچھلے انتخابات کا حال لڑکوں سے دریافت کیا تو اُس کو یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ ساری جماعت میں سوائے جواہر لال کے کوئی بھی صحیح جوابات نہ دے سکا۔ مزید برآں انہوں نے اس انتخابات کا تفصیلی حال سُنایا اور اراکین کیبنٹ کے نام صحت کے ساتھ گنائے۔ دوسری دلچسپی ہوائی جہازوں سے متعلق تھی۔ ایک دفعہ تو انہوں نے موتی لال کو لکھا کہ وہ بہت جلد ہوائی جہاز کے ذریعہ مختصر سی چھٹیاں منانے گھر آنے والے ہیں۔ اس زمانہ میں "ہیرو" میں چار پانچ ہندوستانی طالب علم تھے۔ بروڈا کا ایک شہزادہ تھا۔ جو اِن سے پہلے وہاں تھا۔ اور ان کے وہاں پہنچنے کے

تھوڑے ہی دن بعد واپس ہوگیا۔ اس کے بعد ہی مہاراجہ کپور تھلہ کا شہزادہ "پرمجیت سنگھ" آیا۔ یہ "ہیرو" کو ہندوستان بلکہ اپنی ریاست سمجھ رہے تھے۔ اور اسی شان وشوکت۔ متانت اور وقار سے رہتے بستے تھے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ ہر طرف سے انگلیاں اٹھتی تھیں اور لڑکے چھیڑتے تھے۔

کیمبرج

جواہر لال کو اپنے اسکول اور ساتھیوں سے اتنی دلچسپی ہوگئی تھی کہ ۱۹۰۷ء میں جب انہیں "ہیرو" چھوڑنا پڑا اور ٹرینٹی کالج کیمبرج میں شریک ہونے کے لئے تو وہ بیحد مغموم نظر آنے لگے۔ کیمبرج کے ٹرائی پاس میں انہوں نے اپنے مضامین کیمیا۔ ارضیات۔ اور نباتات لئے۔ اس زمانہ میں عام طور پر ان کے ساتھیوں میں نٹشے برنارڈ شا۔ ایوان بلاک۔ ہیولاک الیس کرافٹ اینگ وغیرہ پر تبصرے اور تنقیدیں ہوا کرتی تھیں۔ اور جواہر لال بھی ان میں دل کھول کر حصہ لیتے تھے۔ آرٹ اور زندگی کے عام طرز کے متعلق آسکر وائلڈ۔ اور والٹر پیٹر کے خیالات طلباء کے دماغوں پر مسلط تھے۔ اور بڑی حد تک جواہر لال بھی ان ہی کے ساتھ تھے۔

کیمبرج کے ہندوستانیوں نے ایک سوسائٹی "مجلس" کے نام سے قایم کی۔ اس میں ہندوستانی مسائل پر آزاد لہجہ میں تبادلہ خیال ہوتا تھا۔ ہر ہندوستانی طالب علم بڑے زور وشور کی تقریریں کیا کرتا تھا سوائے جواہر لال کے۔ ان کی حالت یہ تھی کہ لوگ دق کرتے تھے مگر ان کے کان پر جوں تک نہ رینگتی۔ یہ سنتے سب تھے لیکن کہتے کچھ نہ تھے

وجہ یہ تھی کہ پلیٹ فارم پر آنے سے بہت شرماتے تھے۔ کیمبرج کی انجمن اتحاد میں یہ تجویز پاس ہوئی کہ ہر طالب علم اس کی سرگرمیوں میں حصہ لے اور تقریر کرے۔ کم سے کم ہر "ٹرم" میں ایک دفعہ ورنہ اس پر جرمانہ عائد کیا جائے گا۔ باوجود اس سختی کے جواہرلال تقریر کرنا پسند نہ کرتے تھے اور چپکے سے جرمانہ ادا کر دیتے تھے۔ مسٹر مانٹیگو (جو بعد میں سکریٹری آف اسٹیٹ ہوئے) اکثر انجمن کے مباحثوں میں حصہ لیتے تھے غالباً اس وجہ سے کہ وہ ان دنوں پارلیمنٹ میں کیمبرج کے نمایندے تھے۔ بعض مشہور ہندوستانی لیڈروں نے بھی ان دنوں کیمبرج کی انجمن اتحاد میں تقریریں کیں خصوصاً بپن چندرا پال۔ لجپت رائے اور گوکھلے کی تقریروں نے جواہرلال پر خاص اثر کیا۔

جواہرلال کے ہمعصروں میں سن گپتا۔ سیف الدین کچلو۔ سید محمود۔ تصدق احمد شروانی اور محمد سلیمان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے ہر شخص ہندوستانی مسایل میں برابر کی دلچسپی لیتا تھا اور یہ معلوم کرنا اس وقت ناممکن تھا کہ بعد میں کون کانگریسی ہوگا اور کون حکومت کی ملازمت میں چلا جائیگا۔

کیمبرج سے ڈگری لینے کے بعد مستقبل کا خیال جواہرلال کو بہت پریشان کر رہا تھا۔ انڈین سول سروس کا مقناطیس ایک طرف انھیں کھینچ رہا تھا اور دوسری طرف کسی آزاد پیشہ کے اختیار کرنے کا سوال جاذب نظر ہو رہا تھا۔ سول سروس کا خیال اس لئے چھوڑنا پڑا کہ وہ ابھی اپنی عمر کے لحاظ سے مقابلہ میں شریک نہ ہو سکتے تھے۔ ان کی عمر کا بیسواں سال

اسی وقت شروع ہوا تھا اور مقابلہ کی شرکت کی عمر کم از کم بائیس تھی اس لحاظ سے انھیں کم از کم دو سال ٹھہرنا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ موتی لال کا خیال تھا کہ سویلین ہو کر ان کا اکلوتا بیٹا گھر سے دور رہیگا۔ اس لئے قرعہ فال ان کے خاندانی پیشہ وکالت پر پڑا۔

کیمبرج کے بعد ۱۹۱۰ء میں جواہر لال نے کیمبرج چھوڑا اور لندن میں وکالت کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ یہاں انھیں اپنا پورا وقت اس پر صرف کرنے کی ضرورت نہ تھی اس لئے انھوں نے اپنے اوقات فرصت میں مختلف مضامین پر مطالعہ شروع کیا۔ فبی ان (فیبین) کا ان دنوں زور تھا اور جواہر لال بھی اس سے متاثر ہونے لگے۔ اشتراکیت کے علاوہ آئرلینڈ کا سیاسی انتشار اور عورتوں کا حق رائے دہی نوجوان جواہر لال کو اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ اُنھوں نے اسی سلسلہ میں آئرلینڈ کا سفر بھی کیا اور بچشم خود وہاں کے حالات کا معائنہ کیا۔

لندن کی سوسائٹی نے جواہر لال کو قدرے مسرف بنا دیا اور بعض بعض وقت جو کچھ اُن کے والد بھیجتے تھے وہ ناکافی ہونے لگا اکثر چھٹیوں کے موقع پر وہ یورپ کے سفر کو نکل جاتے۔ ایک دفعہ موتی لال بھی ان کے ساتھ برلن میں تھے کہ کونٹ زیلن پہلی مرتبہ طویل ہوائی سفر سے واپس ہوئے زیلن کے استقبال کے لئے برلن کی آبادی کا بڑا حصہ ٹوٹ پڑا۔ اور ازدحام کی حالت یہ تھی کہ بس جدھر دیکھئے انسان ہی انسان نظر آتے تھے۔ خود قیصر بھی استقبال کے لئے آئے تھے جس سے یہ واقعہ تاریخی یادگار

ہو گیا۔ موتی لال اور جواہر لال جس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے اس کے مالک نے اس رات کو اپنے سارے مسافروں کی خدمت میں کونٹ زپلن کی ایک خوبصورت تصویر بطور تحفہ پیش کی تھی جو ممکن ہے کہ جواہر لال کے ہاں اب بھی محفوظ ہو۔

۱۹۱۲ء میں جواہر لال نے قانونی ڈگری حاصل کر لی اور ہندوستان کا رُخ کیا۔

وکالت سے بیزاری انگلستان سے واپس ہو کر جواہر لال الہ آباد ہائیکورٹ میں رجوع ہو گئے۔ کچھ دنوں تک اُنھوں نے دلچسپی سے کام کیا جیسا کہ ہر شخص نئے پیشے میں داخل ہوتے وقت کرتا ہے، اس کے بعد رفتہ رفتہ ان کی طبیعت اُکتانے لگی۔ ان کے باپ کا اس وقت طوطی بولتا تھا اور گھر میں آٹھوں پہر مقدموں کے چرچے رہتے تھے دوست احباب بھی اسی مذاق کے آتے جاتے اور کتب خانہ بھی قانونی کتب سے بھرا پڑا تھا۔ فضا کی اس یکسانیت نے انھیں وکالت کے پیشہ سے بیزار کر دیا۔ اسی سلسلہ میں ان کے کان کانگریس اور سیاست حاضرہ سے آشنا ہوئے۔ موتی لال بھی اس زمانہ میں وکالت سے بچا ہوا وقت قانون سازی۔ دستور سازی اور سیاست پر صرف کرتے تھے لیکن جواہر لال نے دل ہی دل میں وکالت سے زیادہ سیاست کی ٹھان لی۔ اسی خیال سے کانگریس میں شرکت کی اور اس کے جلسوں میں وقتاً فوقتاً آتے جاتے رہے۔ علاوہ اس کے طبیعت جب ذرا اُچاٹ سی ہو جاتی تھی تو سیر و شکار کی بھی سوجھتی تھی لیکن انھیں

جانوروں کی جان لینے سے زیادہ لطف شکار کے سامان کی تیاری اور اُس کی تلاش میں آتا تھا۔ سوائے ایک دفعہ کے جب کہ انہوں نے کشمیر میں ایک ریچھ کا شکار کیا تھا اِن کا کارنامہ اِس خصوص میں خون آلود نہیں ہوا۔

سر راش بہاری گھوش کا مشورہ

وکالت سے دلچسپی نہ ہونے کے باوجود بھی جواہر لال اس سے بالکل کنارہ کش نہیں ہو گئے تھے۔ شاید اس لئے کہ کوئی اور کام انھیں نہ تھا۔ سر راش بہاری گھوش جو کلکتہ کے مشہور ترین وکیل تھے نہ جانے کیوں ان میں دلچسپی لینے لگے انہوں نے مشورہ دیا کہ وہ قانون پر اپنی دلچسپی کے لحاظ سے کوئی موضوع پسند کریں۔ اور اس پر ایک عمدہ کتاب لکھیں۔ گھوش کے خیال میں اس پیشہ میں منہمک ہونے کا یہی ایک ذریعہ تھا مگر بدقسمتی سے جواہر لال کے بس کا یہ دھندا نہ تھا۔ گھوش اپنی عمر کے تقاضے کی بنا پر تند مزاج ہو گئے تھے اور اپنے "جونیئر" کو وقتاً فوقتاً ڈانٹتے تھے لیکن جواہر لال کے ساتھ کبھی بھی انہوں نے سختی کا برتاؤ نہیں کیا۔

ستیا گرہ

"رولٹ بلز" کے خلاف گاندھی جی نے جب احتجاج شروع کیا تو انہوں نے ساتھ ہی ایک ستیا گرہ سبھا قائم کی۔ جس کے شرکاء کا فرض تھا کہ وہ رولٹ ایکٹ کی خلاف ورزی کریں۔ جواہر لال کی نظریں جو کسی مصروفیت کی متلاشی تھیں۔ اس پر پڑیں۔ اور انھیں گوارا نہ ہوا کہ اس ایکٹ کے ذریعہ حکومت ہند کسی شخص کو قانونی چارہ جوئی کئے بغیر گرفتار کرلے۔ اور قید کردے اس لئے انہوں نے تہیا کرلیا کہ اس سبھا میں شریک

ہوں گے۔ جب اس کی اطلاع موتی لال کو ہوئی تو ان کی پریشانی کی کوئی حد نہ رہی۔ کیونکہ ان کے خیال میں حکومت سے اِس قسم کا مقابلہ ایک بے معنی اور لغو فعل تھا۔ اور سوائے اپنے آپ کو قید کرانے کے کوئی اور مفید نتیجہ برآمد نہیں کرا سکتا تھا۔ علاوہ اس کے اپنے چہیتے لڑکے کو قید خانہ میں دیکھنا ان کے لئے ایک مستقل عذاب تھا۔ جس کے خیال ہی سے وہ لرزہ براندام ہو جاتے تھے۔ ایک دفعہ تو انہوں نے گاندھی جی کو الہ آباد بلایا اور سارے واقعات بتلائے جس کی بناء پر گاندھی جی نے جواہر لال کو سمجھایا کہ وہ اپنے والد کو تکلیف نہ پہنچائیں۔ مگر جواہر لال جتنا سوچتے تھے اتنا ہی اپنے ارادہ میں مضبوط ہوتے جاتے تھے۔ موتی لال کی حالت یہ تھی کہ خواب و خور حرام تھا اور وہ مستقبل کے خیال سے دِل گرفتہ ہوئے جا رہے تھے۔ حتیٰ کہ انہوں نے عمدہ غذا۔ نرم بستر اور آسائش سے کنارہ کشی اختیار کر لی محض یہ اندازہ کرنے کے لئے کہ عنقریب جواہر لال کو قید خانہ میں کسی قسم کی تکالیف سے سابقہ پڑے گا۔

خدا نے موتی لال کی سُن لی اور ستیاگرہ سبھا کو بعض واقعات کی وجہ سے اپنی کارروائی موقوف کرنی پڑی۔

نان کوآپریشن

سنہ ۱۹۲۰ء میں کانگریس کا اسپیشل سشن کلکتہ میں ہوا۔ گاندھی جی کی تحریک نان کوآپریشن پیش ہوئی۔ انتہا پسندوں کے سوا سبھوں نے مخالفت کی۔ لجپت رائے اور سی آر داس نے بھی اِس تحریک کی مخالفت کی۔ جناح جو سروجنی کے الفاظ میں

"ہندو مسلم اتحاد کے پیغامبر" ہیں علحدہ ہو گئے۔ لیکن یہ تحریک عوام میں بیحد مقبول ہونے لگی۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس کے طرفداروں کی ایک کثیر جماعت کمربستہ نظر آنے لگی۔ جواہر لال نے اس میں نمایاں حصہ لیا اور گاندھی جی کے ساتھ مختلف مقامات کا دورہ کیا اور تبادلہ خیال کیا۔ گاؤں اور قصبوں کا دورہ کرنا اور تقریروں کا ایک سلسلہ باندھنا اُن کے فرائض میں شامل تھا۔

پرنس آف ویلز کی آمد ۱۹۲۱ء میں پرنس آف ویلز ہندوستان تشریف لائے۔ اور کانگریس نے تصفیہ کیا کہ اُن کا خیر مقدم نہ کیا جائے۔ کانگریس کو ان کی ذات سے کوئی واسطہ نہ تھا بلکہ حکومت ہند کے خلاف مظاہرہ مقصود تھا۔ بہر حال یہ موقع ایسا تھا کہ حکومت سخت پریشانی اور انتشار کے عالم میں تھی ہندوستان کے ہر طبقہ کے افراد نان کوآپریشن میں شریک تھے۔ علی برادروں کی کوششوں کی وجہ سے مسلمان علماء اور قائدوں کی ایک بڑی جماعت اس میں شریک ہو گئی۔ اور اُن کے ساتھ عوام جوق درجوق اس میں حصہ لینے کے لئے آگے بڑھنے لگے۔

جواہر لال کی پہلی گرفتاری حکومت نے نان کوآپریشن کا جواب گرفتاری سے دیا۔ ہر طرف گرفتاریاں عمل میں آنے لگیں۔ ڈسمبر ۱۹۲۱ء میں ایک دن جواہر لال کانگریس کے دفتر میں تھے کہ انھیں اطلاع ملی کہ پولیس دفتر کی تلاشی کے لئے آئی ہے جواہر لال کے لئے یہ پہلا موقعہ تھا اس لئے ظاہر ہے کہ وہ سراسیمہ ضرور تھے لیکن وضع داری کے

مدِنظر انہوں نے دفتر کے کارکنوں کو احکام دئے کہ وہ بدستور کام میں مشغول رہیں اور پولیس کی کارروائی سے اپنی لاپروائی کا اظہار کریں۔ اسی اثنا میں نہیں یہ اطلاع ملی کہ اِن کا ایک دوست گرفتار ہو چکا ہے اور وہ انہیں خدا حافظ کہنے کے لئے کمرے کے باہر منتظر ہے۔ انتہائی متانت کا اظہار کرتے ہوئے گویا کہ یہ روز کا واقعہ ہے انہوں نے پولیس اور دوست دونوں سے کہا کہ وہ اِن کے خط ختم کرنے تک انتظار کریں۔ دفتر سے اٹھکر جواہر لال گھر پہنچے تو انہیں یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ وہاں بھی خانہ تلاشی ہو رہی ہے۔ اور نہ صرف ان کی قید کے احکام آچکے ہیں بلکہ اُن کے والد کی گرفتاری بھی عمل میں آنے والی ہے۔ موتی لال نے کچھ ہی دن قبل نان کوآپریشن کے والنیٹروں کی فہرست میں اپنا نام درج کرایا تھا اس لئے انہیں بھی خمیازہ بھگتنا پڑا۔

دسمبر ۱۹۲۱ء اور جنوری ۱۹۲۲ء میں گرفتاریوں کی تعداد تقریباً تیس ہزار ہو چکی تھی مگر گاندھی جی ابھی گرفتار نہیں کئے گئے تھے۔ فبروری ۱۹۲۲ء میں قیدخانہ میں یہ خبر نہایت بددلی کے ساتھ سُنی گئی کہ گاندھی جی نے اپنی تحریک بند کر دی۔ خواہ وہ کتنی ہی قلیل مدت اور کسی خاص مصلحت وقت کے لئے ہی کیوں نہ ہو لیکن قیدیوں کو اس سے روحانی صدمہ پہنچا۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ گاندھی جی کو بھی ایک طویل مدت کے لئے قید کر لیا گیا۔

دوسری گرفتاری جواہر لال کو تعجب ہوا کہ چھ مہینہ کی سزا سُنا کر تین مہینہ بعد انہیں رہا کر دیا گیا۔ مارچ میں چھٹکارا ملا تو یہ فوراً گاندھی جی کے ہاں پہنچے۔ مگر وہ اسی وقت گرفتار ہو چکے تھے۔ چھ ہفتہ بعد اپریل ۱۹۲۲ء

میں اُنھیں دوبارہ قید کرلیا گیا۔ آٹھ مہینہ تک لکھنو جیل میں اُنہیں رکھا گیا۔ جنوری ۱۹۲۳ء میں لکھنو جیل کے تمام سیاسی قیدیوں کی رہائی عمل میں آئی۔ اور اسی سلسلے میں جواہرلال بھی رہا ہو گئے۔

مولانا محمد علی کے ساتھ

دسمبر ۱۹۲۳ء میں کانگریس کا سشن "کوکاناڈا" میں ہوا۔ مولانا محمد علی پریسیڈنٹ مقرر ہوئے۔ اور اُنہوں نے جواہرلال کو معتمد بننے کے لئے اُکسایا۔ اِن دنوں محمد علی اور جواہرلال کے بہت اچھے تعلقات تھے اور مولانا کا خیال تھا کہ دوسرا معتمد اُن کے ساتھ اس عمدگی سے اتحاد عمل نہ کرسکیگا جیسا کہ جواہرلال کرینگے۔ جواہرلال مولانا کی تحریک کو رد نہ کرسکے اور ذمہ دارانہ عہدہ اُنہوں نے پہلی دفعہ قبول کرلیا۔

جواہرلال نے محمد علی کے مشورہ کے بغیر اپنی معتمدی کے زمانہ میں یہ طریقہ رائج کرنا چاہا کہ کسی کانگریسی کو پنڈت۔ مہاتما۔ مولانا۔ مولوی۔ مسٹر۔ اسکوائر یا اسی قسم کے کسی الفاظ سے مخاطب نہ کیا جائے۔ لیکن محمد علی نے فوراً بہ حیثیت صدر اُنہیں حکم دیا کہ وہ گاندھی جی کو مہاتما لکھا کریں۔ اِس کے علاوہ محمد علی سے مذہب کے بارے میں بھی کبھی کبھار بحث ہوجاتی تھی۔ مولانا کی عادت تھی کہ ہمیشہ لکھنے پڑھنے بولنے میں ہر وقت خدا کے نام سے شروع کرتے خواہ دوسروں کے نقطہ نظر سے اس کا موقع ہو یا نہ ہو۔ اِس کے برخلاف جواہرلال کو اِس قسم کی حرکتوں سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ لیکن وہ کبھی مولانا سے مذہبی بحث کرنا نہ چاہتے تھے۔ کیونکہ مولانا کا جوش و خروش دیکھکر اُنہیں اندیشہ تھا کہ اس قسم کی بحث سے کہیں فائدہ کی جگہ نقصان نہ ہو۔

مولنا بھارت ماتا کی سیوا میں کبھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ خطرے کے وقت لوگوں کو آگے کر کے خود پیچھے رہیں۔ ۱۹۲۹ء میں کانگریس کے نامزد پریسیڈنٹ کی حیثیت سے جب لاہور میں جواہر لال نے خطبہ پڑھا اور اس میں کئی مقامات پر انتہا پسندی کا اظہار کیا تو مولنا نے اس پر سخت تنقید کی۔ "میں تمہیں متنبہ کرتا ہوں جواہر" انہوں نے کہا "کہ تمہارے موجودہ کانگریس کے ساتھی تم سے وفا نکریں گے۔ پریشانی کے وقت وہ تم سے علیحدہ ہو جائینگے۔ تمہاری کانگریس کے ساتھی ہی تمہیں سُولی پر چڑھائینگے" یہ ان کی آخری نصیحت تھی کیونکہ اس کے بعد وہ ۱۹۳۰ء میں پہلی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن گئے۔ اور پھر واپس نہ آئے۔

برسیلز کانگریس ۱۹۲۶ء کے اواخر میں جب جواہر لال یورپ میں تھے انہیں اطلاع ملی کہ فروری ۱۹۲۷ء میں "مظلوم اقوام کی کانگریس" برسیلز میں ہونے والی ہے۔ انہوں نے انڈین نیشنل کانگریس کو لکھا کہ اس موقع پر کوئی ان کا نمایندہ بھی شریک ہو تو اچھا ہوگا۔ کانگریس نے جواہر لال ہی کو اپنی نمائندگی کے اختیارات دیئے۔ میکزیکو۔ جاوا۔ انڈوچینا۔ فلسطین۔ شام۔ مصر۔ شمالی آفریقہ کے عرب، اور حبشی اس کانگریس میں شریک ہوئے اور مباحث سرگرمی کے ساتھ چھیڑے گئے۔ مسٹر لانسبری نے اس کی صدارت کی۔

اس کانگریس کے علاوہ ایک لیگ شہنشاہیت کے خلاف بھی قائم ہوئی اور اس میں آئن شائن۔ رومن رولینڈ اور مادام سن یت سن جیسی قابل ہستیاں شریک ہوئیں۔ جواہر لال ان دونوں انجمنوں کے اجلاسوں میں متعدد مقامات پر

شریک ہوئے اور ۱۹۲۷ء کے موسمِ گرما میں موتی لال بھی یورپ پہنچے۔ جواہر لال۔ اُن کے والد۔ اُن کی بیوی اور اُن کی بہن سب کچھ دنوں تک یورپ میں ساتھ رہے۔ پھر سب مل کر ماسکو گئے جہاں سوویٹ کی دہ سالہ سالگرہ ہونے والی تھی۔ موتی لال کی عمر دستور سازی اور قانون سازی میں گزری تھی۔ اور انہیں انقلابات پر کچھ زیادہ بھروسہ نہ تھا۔ باوجود اِس کے ماسکو کے حالات سے وہ کافی متاثر ہوئے یہاں جواہر لال کو پہلی دفعہ سائمن کمیشن کے قیام کا علم ہوا۔ کچھ دنوں بعد موتی لال کو ایک پُرانے زمینداری مقدمہ میں پریوی کونسل لندن میں پیروی کرنی تھی۔ سر جان سائمن بھی اِس مقدمہ میں اُن کے شریک کار تھے۔ اِس لئے جب سر جان سائمن کے مکان پر وہ اور موتی لال باہم مشورہ کے لئے جمع ہوئے تو گو کہ جواہر لال کو اس میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ لیکن سائمن کے کہنے پر وہ بھی شریک ہوئے۔

۱۹۲۷ء کا سال قریب الختم تھا اور جواہر لال کو کانگریس کے اجلاس میں شریک ہونا تھا۔ اِس لئے وہ اپنے والد کو چھوڑ کر مع اپنی بہن اور بیوی کے ہندوستان چلے آئے۔

کانگریس کی صدارت ۱۹۳۶ء میں جواہر لال کانگریس کے صدر، دوسری مرتبہ منتخب ہوئے۔ عوام میں گاندھی جی کے بعد شائد سب سے زیادہ ہر دل عزیز جواہر لال نہرو ہیں۔ اُن کی مقناطیسی شخصیت، جادو بیانی اور آہنی عزم و استقلال نے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں اُن کے طرفدار پیدا کر دیئے۔ لیکن اُن کے خیالات انتہا پسندانہ ہیں اور انتہائی آزادی کے سوا کوئی دوسری چیز لینے پر آمادہ نہیں۔ حکومت کے ساتھ اشتراکِ عمل کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوتے۔ خواہ اُس سے ملک کا

کوئی فائدہ ہی کیوں نہ حاصل کیا جا سکتا ہو۔ اُن کا رجحان اشتراکیت کی طرف مائل نظر آتا ہے۔ اور حالیہ کانگریس کے خطبۂ صدارت میں انھوں نے اُس کا جس طور پر ذکر کیا ہے وہ کچھ زیادہ قابلِ عمل معلوم نہیں ہوتا۔ خود کانگریس کے سنجیدہ طبقہ میں اشتراکیت پسندانہ خیالات ناقابلِ عمل قرار دیئے گئے اور اُن پر سخت تنقیدیں ہوئیں۔

کملا نہرو کی وفات | ۱۹۱۶ء میں جواہر لال کی شادی کملا دیوی سے ہوئی تھی اُس وقت سے کملا کے انتقال تک دونوں میں غیر معمولی محبت تھی۔ حالانکہ جواہر لال نے ۱۹۲۱ء کے بعد سے اپنی زندگی کے زیادہ دن جیل میں گزارے۔ در اصل اُن کی ایک رہائی دوسری گرفتاری کا پیش خیمہ ہوتی تھی۔ اور دونوں کے درمیان اتنا کم وقفہ ہوتا تھا کہ انہیں اپنے گھریلو کام کاج کے لئے وقت ہی نہ ملتا تھا۔ موتی لال ۱۹۳۱ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس کے بعد سے جواہر لال کی والدہ کی صحت خراب ہونے لگی۔ لیکن اُن کی حالت درست ہوئی تو کملا کی صحت بگڑنے لگی۔ کئی دفعہ انھوں نے سخت بیماریاں جھیلیں۔ لیکن آخری دفعہ ۱۹۳۴ء میں جب جواہر لال الموڑا جیل میں تھے۔ اُن کی حالت متغیر ہوئی۔ بمبئی میں علاج کے لئے وہ یورپ چلی گئیں۔ مگر جواہر لال کی عدم موجودگی کی وجہ سے اُن کے مرض میں کسی طرح افاقہ نہ ہوتا تھا۔ آخر جب حالت غیر ہوئی تو حکومت نے جواہر لال کو ۴ ستمبر کو قید سے رہا کیا اور وہ فوراً یورپ پہنچے۔ لیکن افسوس کہ کچھ عرصہ بعد کملا انہیں داغ مفارقت دے گئیں اور اپنی اکلوتی لڑکی اندرا کو تنہا چھوڑ گئیں۔

تصانیف | چونکہ جواہر لال کی زندگی ۱۹۲۱ء کے بعد سے زیادہ تر قید میں گزری اور قید خانہ میں سیاسی قیدیوں کو بعض خاص حالات کے سوا لکھنے پڑھنے

کی ممانعت نہیں ہوتی۔ اِس لئے اُن ہی ایام میں جواہرلال نے تصنیف وتالیف کا کام کیا۔ وہ خطوط جو اُنہوں نے قیدخانہ سے بیٹی کے نام لکھے ہیں۔ کتابی صورت میں شائع ہوکر بہت مقبول ہوئے "رِدِ دھرانڈیا" اِن مضامین کا مختصر سا مجموعہ ہے جو اس وقت اخباروں میں شائع ہوئے۔

اسی سال ۱۹۳۶ء میں اُنھوں نے اپنے خودنوشتہ سوانح شائع کئے۔ جس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اپریل سے جولائی تک اس کے پانچ اڈیشن شائع ہوئے۔

تمت

۲۳۱۲